DUE DATE

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1 per day, Over night book Re. 1 per day.

مولانا آزاد سبحانی

تحریکِ آزادی کے ایک مقتدر رہنما

از

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور

انتشارات ادارۂ تحقیقات پاکستان

شمارہ ۳۷

ادارۂ تحقیقات پاکستان متروکہ اوقاف بورڈ حکومتِ پاکستان کی مالی امداد کا ممنون ہے جس کی وجہ سے ادارے کے لیے تصنیف و تالیف کا کام آسان ہو گیا ہے ۔

طبع اول : فروری ۱۹۸۹ء

ISBN 969-425-071-4

قیمت : ۸۰ روپے

طابع : ایس ۔ ایم اظہر رضوی

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز ، ۱۰۸ ۔ لٹن روڈ ، لاہور

تشکر

فاضل مصنف نے یہ کتاب ادارۂ تحقیقات پاکستان کو بطور عطیہ عنایت فرمائی ہے جس کے لیے ادارہ موصوف کا بے انتہا سپاس گزار ہے -

فہرست

صفحہ

پیش لفظ --- ک

پہلا باب

حالات زندگی --- ۱

دوسرا باب

مولانا آزاد سبحانی اور تحریک پاکستان --- ۱۷

تیسرا باب

تحریک ربانی/خلافت ربانی --- ۳۷

چوتھا باب

مولانا آزاد سبحانی بحیثیت فلسفی --- ۵۴

پانچواں باب

دینداری و دینی خدمات --- ۸۰

چھٹا باب

مولانا آزاد سبحانی اور سوشلزم/کمیونزم --- ۱۰۳

ساتواں باب

سفر نامہ ربّانی کے اقتباسات --- ۱۰۷

آٹھواں باب

آزاد سبحانی بحیثیت ادیب و شاعر --- ۲۲۷

اشاریہ --- ۲۵۷

مولانا آزاد سبحانی

مرتضیٰ حسین
مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی
جمیلہ خاتون
حسن سبحانی
باقی دو بیٹیاں
شاہد سبحانی

پیش لفظ

مجلس عاملہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے اجلاس (۸۷-۱۹۸۶ء) میں تحریک پاکستان کے تاریخی پس منظر اور مآخذ پر غور کے دوران راقم کی اس تجویز کو قبول کر لیا گیا کہ آزادی وطن کے ان راہنماؤں کی سوانح کو مرتب کیا جائے جن پر ابھی تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا اور خصوصاً پاکستان کے ہر خطے میں سے حصول پاکستان کے لیے جو جد و جہد کی گئی اور جن مخلص کارکنوں نے قربانیاں دیں ان کے حالات کو مرتب کرکے شائع کیا جائے ۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں مولانا آزاد سبحانی کی سوانح مرتب کرنے کی ذمہ داری میں نے قبول کر لی ۔ میری اس پیش کش کی خاص طور پر دو وجوہات تھیں ۔ اول یہ کہ مولانا آزاد سبحانی بلاشبہ ایک بڑے مسلم راہنما تھے جنھوں نے نہ صرف قیام پاکستان کی حمایت کی بلکہ عملی طور پر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حصول آزادی سے چند ماہ پہلے مجھے ان سے ملنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور میں ان کی قلندرانہ شخصیت ، علمی تبحر اور خاص طور پر ان کی اس اولوالعزمی سے بہت متاثر ہوا کہ وہ حصول پاکستان کے بعد بھی ہندوستان میں رہ کر وہاں کے مسلمانوں کی تنظیم و ترقی کے لیے عملی طور پر اقدام کرنے والے تھے۔ اس وقت وہ پاکستان کے قیام ، تقویت

اور آئندہ ترقی کے لیے دعا گو تھے ۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد ان کا اپنے ہم وطن بھائیوں کو چھوڑ کر پاکستان آ جانے کا ارادہ نہ تھا ۔ چنانچہ وہ حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں ہی رہ کر مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے اور وہیں پر فوت ہوئے ۔ رحمہ اللہ

یہ سال ۱۹۴۶ء کے نصف آخر کا ذکر ہے جب میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں طالب علم تھا ۔ عیدالاضحیٰ کا موقعہ تھا اور ہم نے سنا کہ ہندوستان سے ایک عالم دین آئے ہیں جو شہر نیویارک میں مسلمانوں کو نماز عید پڑھائیں گے۔ ”انڈین سمین کلب“ کی مسلم جماعت کی طرف سے ان کو مدعو کیا گیا تھا ۔ یہ جماعت بنگال کے باشندہ مسلمانوں کی تھی ۔

عید کے دن جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں نماز کا انتظام تھا تو معلوم ہوا کہ وہ عالم دین مولانا آزاد سبحانی ہیں ۔ غالباً کلکتہ میں عید کے موقع پر مولانا آزاد سبحانی کی امامت کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کو نیویارک میں امامت کے لیے مدعو کیا گیا تھا ۔ مولانا صاحب نماز عید کا خطبہ عربی میں دینے والے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خطبہ کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی سنایا جائے ۔ چونکہ میں عربی سےکچھ مانوس تھا ۔ لہٰذا یہ خدمت میرے سپرد کی گئی ۔ مولانا نے بڑا مؤثر اور شاندار خطبہ دیا ، البتہ کہہ نہیں سکتا کہ میں نے ترجمہ کا حق کہاں تک ادا کیا ؟ بہرحال یہ ایک سبب بنا کہ مولانا سے میری قریبی ملاقات ہو گئی ۔ میں ان کی درویشانہ ، مدبرانہ اور جاذب نظر شخصیت کا گرویدہ ہوگیا ۔

نماز عید کے بعد ہم اپنے ہوسٹل واپس آئے اور دوسرے دن تعلیمی پروگرام میں مشغول ہو گئے۔ شاید دو روز گزر گئے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ مولانا صاحب کا پتہ کرنا چاہیے کہ اب وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں ۔ اس ارادے سے کچھ وقت بچا کر میں "انڈین سیمین کلب" پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں اور تو کوئی بھی نہیں البتہ مولانا صاحب دروازے کے ساتھ ایک بینچ پر تن تنہا بیٹھے ہیں ۔ میں نے مصافحہ کیا اور حال پوچھا ! کہنے لگے سب خیر ہے ، ہاں اس وقت آپ اگر مجھے تمبا کو دلوا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی ۔ مولانا صاحب ان دنوں پائپ پیتے تھے ۔ پائپ ان کے ہاتھ میں تھا اور منہ کو لگا رہے تھے۔ لیکن سلگا ہوا نہیں تھا ۔ میں تمبا کو کی ڈبیا خرید کرکے لایا اور مولانا پائپ سلگا کر بہت خوش ہوئے ۔

بعد میں باتوں میں پتہ چلا کہ کل صبح سے لے کر انھوں نے کچھ کھایا بھی نہیں اور نہ ہی وہاں کوئی انہیں کھلانے والا تھا ۔ میں نے حسبِ حال کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور پھر ان سے یوں گذارش کی کہ :

مولانا صاحب ! آپ یہاں اکیلے ہیں اگر اجازت ہو تو میں آپ کے لیے کہیں رہائش کا انتظام کر دوں جو کہ یہاں کے غریب مسلمانوں کے یہاں ہوگا ۔ یہ سن کر انھوں نے فوراً مان لیا ۔ میں نے اسی شام کو اکیڈمی آف اسلام کے ایک رکن مختار احمد صاحب کے یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کرا دیا۔

یہ اکیڈمی "ہارلم" میں تھی ۔ "ہارلم" حبشی نسل کے لوگوں کا مسکن ہے ۔ اس اکیڈمی کی بنیاد کچھ سال پہلے عطیہ بیگم مرحومہ نے ڈالی تھی ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عموماً کوئی باہر سے آنے والا مسلمان "ہارلم" کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ لیکن عطیہ بیگم مرحومہ نے وہیں پر ایک اسلامی ادارہ کی بنا ڈالی تھی ۔ میں اور ایک دو طلبہ رفیق اتوار کے روز اکیڈمی آف اسلام میں جاتے تھے ۔ نو مسلموں سے ملتے تھے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے ۔ وہاں کے ایک سرگرم رکن محترم مختار احمد تھے جن کا اپنا گھر تھا ۔ میں نے جب ان سے مولانا کی رہائش کے مسئلے کا ذکر کیا تو محترم مختار احمد نے بخوشی قبول کر لیا کہ مولانا موصوف ان کے ہاں بطور مہمان ٹھہریں ۔ چنانچہ میں مولانا صاحب کو ان کے گھر لے آیا اور مختار صاحب اور ان کی اہلیہ نے مولانا کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص کر دیا اور ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے رہے ۔ اس کے بعد مولانا صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں ان کے تبحر علمی سے استفادہ کرتا رہا ۔

مولانا موصوف کافی عرصہ (غالباً تین چار مہینے) تک وہاں مقیم رہے ۔ اس مدت میں وہ ہر اتوار اور کبھی دوسرے اتوار کو شہر نیویارک کی مسلم تنظیموں کو اپنے خطبات سے نوازتے تھے ۔ مولانا کا خطاب عربی میں ہوتا تھا اور میں ان کے انگریزی مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا ۔ ایک روز فرمایا کہ :

آج میں انگریزی میں تقریر کروں گا اور جہاں میرے الفاظ

میں کمی محسوس ہو وہاں آپ مناسب الفاظ ڈال دیجیے گا اور جس جگہ میرے الفاظ مبہم لگیں وہاں ان کا آسان نعم البدل بیان کر دیجیے گا۔

انگریزی میں ان کا پہلا خطاب تھا تو انتہائی دلچسپ، مگر حاضرین ان کے مافی الضمیر کو سمجھ گئے۔ یونہی چار پانچ تقریریں کرنے کے بعد ان کے انگریزی انداز بیان میں کافی صحت اور معنویت پیدا ہوگئی اور ہم محو حیرت ہو کر ان کی ذہانت پر داد دینے لگے۔

بعد ازاں ایک بار مجھے فرمایا کہ میں فلسفۂ ربانیت کی روشنی میں اسلام کے متعلق انگریزی میں ایک کتابچہ لکھنا چاہتا ہوں جسے اگر آپ شائع کروا دیں گے تو یہاں پر رہنے والوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ایک دو روز میں مسودہ تیار کر لیا اور تصحیح کے لیے مجھے دے دیا۔ میں نے اس کی مناسب اصلاح کر دی اور ایک تعارفی نوٹ کا اضافہ کرکے اسے شائع کروا دیا۔ اس کتابچہ کا متن اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ ان دنوں "عبداللہ عثمان السندی" کے قلمی نام سے لکھا کرتا تھا اور تعارف کے آخر میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں ہمارے ایک پروفیسر صاحب نفسیات کے گیسٹالٹ (Gestalt) نظریے کی توضیح و تفسیر کر رہے تھے اور فہم و ادراک (Learning) کے سلسلے میں فرما رہے تھے کہ ادراک بتدریج نہیں ہوتا بلکہ بہ یک وقت فوری طور پر ہوتا ہے۔ ہم نے مولانا صاحب کو ہوسٹل میں بلایا تھا جہاں پر طلبہ ان سے علمی سلسلے کے سوالات پوچھ رہے تھے۔

چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آیا ادراک مجمل ہے یا مفصل؟ اس پر انھوں نے بڑی دقیق گفتگو فرمائی جو اس کتاب کے صفحات (ص ۷۲ - ۷۳) پر درج ہے -

مولانا صاحب سے صحبتوں کا سلسلہ جاری رہا اور میں متواتر طور پر ان کے ہاں آتا جاتا رہا - اچانک ایک روز فرمایا کہ اب میں یہاں سے رخصت ہونے والا ہوں - میں نے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ ہے ؟

فرمایا : "مصر" - میں نے دریافت کیا کہ وہاں کون ہے، کس کے پاس جا کے ٹھہریں گے ؟

تو فرمایا :

کئی اللہ کے بندے ہوں گے کسی کے پاس چلا جاؤں گا اور کوئی نہ کوئی تو مجھے ٹھہرا ہی لے گا ! ساتھ ہی فرمایا کہ مصر سے ہوتے ہوئے ہندوستان چلا جاؤں گا اور وہاں جاکر جواہر لعل نہرو سے ملوں گا - یہاں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے یہ ان کے گوش گزار کروں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کروں گا تا کہ حصول آزادی کے بعد مسلمان وہاں پر عزت کی زندگی بسر کر سکیں -

میں نے پوچھا کہ اس کے بعد آپ کے کیا پروگرام ہوں گے ؟

فرمایا :

"ہندوستان کے بعد روس جاؤں گا اور وہاں اپنے فلسفہ ربانیت کی روشنی میں ان کو سوشلزم کے صحیح مفہوم کی طرف راہنمائی کروں گا۔ میرے خیال میں ، مولانا سوشلزم کے بعض پہلوؤں کو اچھا تصور کرتے تھے، خاص طور پر یہ کہ سوشلزم میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کو ایک مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کے خیال میں یہ جذبہ اسلامی فکر کی روح میں سے ہے۔ فرماتے تھے کہ از روئے قرآن خود اللہ تعالیٰ کی ایک ذی شان صفت "ورکر" کی سی ہے کہ " کل یوم ہو فی شان" (الرحمٰن : ۲۹)۔

چنانچہ اپنے اسی فکر کے پیش نظر انھوں نے اپنے انگریزی کتابچے میں بھی ایک باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ بحیثیت ایک ورکر کے"۔

جب مولانا کے "ہارلم" سے رخصت ہونے کی خبر وہاں کے مسلمانوں کو ملی تو وہ ان سے ملنے آئے اور پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ٹکٹ آ گیا ہے ؟

فرمایا :

"ٹکٹ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے ! اللہ تبارک و تعالیٰ کوئی صورت پیدا کر دے گا"۔ اس پر اکاڈمی آف اسلام کے ممبروں نے مل کر رقم جمع کی اور مولانا کے لیے بحری جہاز کا ٹکٹ

خرید لیا ۔ ساتھ ہی ان کے لیے دو چار کپڑوں کے جوڑے جن میں ٹاپ کوٹ اور پینٹ شامل تھے ، خرید لیے ۔ ایک ٹرانک اور ایک بیگ اور ان میں مولانا کے کپڑے اور مناسب سامان سفر بھر دیا گیا ۔

مقررہ تاریخ پر ہم بندرگاہ پر مولانا کو الوداع کہنے گئے ۔ ان کے لیے جمع کیا جانے والا زادِ رہ بھی ہمارے ساتھ تھا ۔ سامان دیکھ کر انھوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور فرمایا :

”میں نے نہ کبھی پہلے سامان اٹھایا ہے اور نہ اب اٹھاؤں گا ۔ اس روز میں نے اپنے بھائیوں کی دل شکنی کرنی مناسب نہ سمجھی تھی ۔ اب میرے لیے جمع کیا جانے والا سامان یہیں پر رہنے دو تا کہ کسی ضرورت مند کے کام آ سکے“۔

. . اور پھر ہم سے مصافحہ کر کے اوپر جہاز میں چلے گئے ۔

اس کتاب کے محتویات کے بارے میں کچھ کہنا مناسب سمجھتا ہوں ۔ محترمہ ناظرہ خاتون (مولانا آزاد سبحانی کی صاحبزادی) سے میں نے مولانا آزاد سبحانی پر ایک انٹرویو کیا تھا جس کے اہم نکات کو اس کتاب کے ”پہلے باب“ میں حاشیہ نمبر ۳۷، ۳۸ اور ”دوسرے باب“ میں حاشیہ نمبر ۲۰ کے تحت درج کر دیا گیا ہے اور دونوں ابواب کے آخر میں ان کا ذکر ”انٹرویو ڈاکٹر این ، اے بلوچ از محترمہ ناظرہ خاتون“ کی عبارت سے کیا گیا ہے ۔

علاوہ ازیں ”مسودات ڈاکٹر این ، اے بلوچ“ کے عنوان سے

"دوسرے باب" کے حواشی نمبر ۸ ، ۳۸ میں جو اشارہ کیا گیا ہے وہ میری مولانا آزاد سبحانی سے اخذ کردہ ان یاد داشتوں سے ماخوذ ہے جو میں نے ان سے نیویارک میں ملاقاتوں کے وقت تحریر کی تھیں۔

مولانا صاحب کے فلسفہ و تنقید سے متعلق دو غیر مطبوعہ تحریریں جو میرے پاس محفوظ ہیں اور جنھیں میں نے نیویارک کی ملاقات میں ہی ان سے ایک مرتبہ "فلسفہ اور علم تنقید" کے موضوع پر بات کرتے ہوئے مختصراً قلمبند کر لیا تھا وہ اس کتاب کے "چوتھے باب" میں درج ذیل عنوانات کے تحت جمع کر دی ہیں :

ضرورت فلسفہ (ص ٦٣- ٧٣) تنقید کے مقدمات (ص ٧٣- ٧٤) علم تنقید (ص ٧٧ - ٧٩) - یہ تحریریں بھی پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہیں -

ان دنوں مولانا موصوف کی بعض نشستوں میں ان کے اشعار سننے کا بھی موقع ملا اور نیویارک سے جاتے وقت وہ اپنی ایک شعری بیاض بھی مجھے عنایت کر گئے ۔ اس کتاب کے " آٹھویں باب " میں "اشعار " کے عنوان سے صفحات ۲۳۰ - ۲۵٦ میں دیا جانے والا کلام بالخصوص ان کی "شعری بیاض" پر مبنی ہے ۔ مولانا صاحب کی سوانح پر تحقیق و جستجو کے سلسلے میں مولانا آزاد سبحانی کا سفر نامہ مرتبہ حسن سبحانی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۱ء جو اب نایاب ہے ، ہاتھ آیا جس کے بعض اقتباسات استفادہ عام کے لیے اس کتاب کے "ساتویں باب" میں جمع کر دیے ہیں ۔

بہرحال مقدور بھر مولانا آزاد سبحانی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مجھے امید ہے کہ مولانا اور ان کے کام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی ۔

اس کتاب کی طباعت اشاعت کے لیے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کی مجلس عاملہ ، سوسائٹی کے نگران محترم بی ۔ اے قریشی صاحب اور ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر شکور احسن کا شکرگزار ہوں ۔ بالخصوص میں اپنے کرم فرما مولانا بشیر احمد خان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے طباعت کے دوران نہ صرف پروف پڑھے بلکہ متن و حواشی میں بعض مقامات پر اصلاح فرمائی ۔

نبی بخش بلوچ

اسلام آباد

۷ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ

۱۶ جنوری ۱۹۸۹ء

پہلا باب

حالاتِ زندگی

نام و نسب

آپ کا نام عبدالقادر تخلص آزاد اور قلمی نام آزاد سبحانی تھا ۔ آپ کے والد شیخ محمد مرتضٰی بن شیخ محمد سجاد ، ایک معمولی زمیندار گھرانے کے فرد تھے ۔ شیخ محمد مرتضٰی مشہور صوفی بزرگ اور شاعر عبدالعلیم آسی (سکندر پوری) المشہور آسی غازی پوری سے بیعت تھے[1]۔

والدہ ماجدہ

آپ کی والدہ ماجدہ کا نام ناظرہ خاتون تھا ۔ بہت نیک طینت خاتون تھیں ۔ ایران کے شہر سبزوار سے تعلق رکھتی تھیں ۔ ۱۸۸۸ء میں جب مولانا آزاد سبحانی صرف چار برس کے تھے، آپ کی والدہ ماجدہ اس دنیا سے انتقال کر گئیں[2]۔

ولادت

آپ مشرق یو پی کے مردم خیز قصبہ سکندر پور ضلع بلیا میں پیدا ہوئے ۔ بیشتر مؤرخین نے آپ کا سال ولادت ۱۸۸۲ء لکھا ہے ،

لیکن سال ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اس ضمن میں ۱۸۸۱ء اور ۱۸۷۳ء کے سال بھی منقول ہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ کے انتقال کے وقت آپ صرف چار برس کے تھے، اس طرح آپ کا سال ولادت گویا ۱۸۸۴ء ہوتا ہے ، لیکن اس بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا[۳]۔

تعلیم

منقول ہے کہ آپ کے والد ماجد فرزند کی محبت اور غالباً اپنے دینی مشاغل کی وجہ سے ، آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ دے سکے ۔ ۱۴ سال کی عمر تک مولانا کھیل کود میں مصروف رہے۔ ایک روز پتنگ بازی میں مصروف تھے کہ اچانک انھیں یہ احساس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ اے عبدالقادر ، تم کب تک کھیل کود میں وقت ضائع کرتے رہو گے ۔ اس آواز نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ مولانا گھر چھوڑ کر اپنی پھوپھی کے ہاں پہنچے، جو قریب کے موضع میں منسوب تھیں ۔ ان سے تعلیم شروع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور حصول علم کے لیے جونپور پہنچے ۔ نواب عبدالمجید صاحب کے قائم کردہ مدرسہ میں ، جس کے صدر مشہور عالم مولانا ہدایت اللہ رامپوری تھے ، داخلہ لے لیا . . . جونپور میں طالب علمی کے ایام میں بہت محنت اور لگن سے کام کیا[۴]۔

حصول علم کی لگن ، آپ کو کشاں کشاں جونپور سے رامپور لائی ۔ مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے اور ایک عرب عالم ، مولانا طیب سے عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی[۵] ۔

فاتحۂ فراغ

کچھ عرصہ فرنگی محل لکھنؤ میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے - نیز پیلی بھیت میں حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی سے تفسیر و حدیث کا درس لےکر ۱۹۰۳ء میں فاتحۂ فراغ پڑھی[6]۔

ہم درس

آپ کے ہم درس حضرات میں مولانا محمد فاخر الہ آبادی ، مولانا مشتاق احمد کانپوری اور مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی جیسے علماے کرام کے اسماے گرامی آتے ہیں[7]۔

طب سے لگاؤ

مولانا کو علم طب سے بھی دلچسپی تھی اور انھوں نے اس کی تعلیم حکیم صدیق احمد صدیقی (مدفون بریلی - اصل وطن امروہہ) کے والد صاحب سے حاصل کی تھی[8]۔

دوران تعلیم دیگر مشاغل

مولانا کو تیراکی کا بڑا شوق تھا اور آپ دریاے گومتی میں گھنٹوں تیراکی کرتے تھے . . . نیز فنون لطیفہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی ، خصوصاً رقص و سرود کی ہر اس محفل میں شریک ہو جاتے جہاں اذن عام ہوتا - درس نظامی کے تحت تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ موسیقی میں بھی دلچسپی لی اور باقاعدگی سے اس فن کو سیکھا[9] -

نصیحت استاد

دوران تعلیم ، آزاد سبحانی صاحب آہستہ آہستہ غیر روایتی سرگرمیوں میں زیادہ مصروف ہوگئے ، تو ان کی شکایت ان کے استاد

مولانا ہدایت اللہ سے کی گئی ۔ استاد کے استفسار پر ، مولانا آزاد سبحانی نے صفائی اور بیباکی سے جواب دیا کہ کتابوں میں ان کے مصنفین ، جو نتائج نکالتے ہیں ان سے انھیں اختلاف ہوتا ہے ، جس کی وجہ سے طبیعت درس کی طرف راغب نہیں ہو پاتی ۔ مولانا ہدایت اللہ کو آزاد سبحانی کی ذہانت اور فکر رسا کا بخوبی اندازہ تھا ۔ انھوں نے شاگرد عزیز کو سخت سست کہنے کے بجائے ان کی ایک طرح سے ہمت افزائی کی ۔ کہا "عزیزم علم حفظ کا نہیں فکر کا نام ہے ، چونکہ تم دوسرے طلبہ سے مختلف ہو اس لیے تم پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جاتی"[۱۰]۔

استاد کا اثر مولانا کی زندگی پر

حسن سبحانی کے بقول ان کے والد (مولانا آزاد سبحانی) مولانا ہدایت اللہ کے استغناء اور انکسار سے متاثر تھے ۔ مولانا ہدایت اللہ کی قناعت پسندی اور استغناء کا یہ حال تھا کہ والیِ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کے اصرار کے باوجود بھوپال جا کر خوش حالی اور جاہ و جلال کی زندگی گزارنے کے بجائے جونپور کے مفلوک الحال مدرسہ ہی میں رہ کر خدمت کرنے کو ترجیح دی'' . . . آزاد سبحانی، مولانا ہدایت اللہ کے علمی مقام ، حلم ، قناعت ، استغناء اور کردار کی پختگی سے بے حد متأثر تھے ۔ وہ اپنی خصوصی مجلسوں میں اکثر مولانا ہدایت اللہ کا ذکر کرتے تھے کہ انھوں نے جب مولانا کو دیکھا تھا تو وہ پچھتر سال کی عمر کے قریب تھے اور اس قدر حسین تھے کہ اتنا حسین شخص انھوں نے کسی اور کو نہیں پایا[۱۲]۔ مولانا آزاد سبحانی کے کردار پر مولانا ہدایت اللہ کی گہری چھاپ

نظر آتی ہے۔ یہ بھی تمام عمر ملک و ملت کے لیے جد و جہد میں مصروف رہے اور کبھی کسی صلہ یا انعام کی توقع نہ کی ، تمام عمر ایک عجیب شان استغناء سے گزاری ۔ بڑے سے بڑے صاحب جاہ و ثروت سے کبھی مرعوب نہ ہوئے اور بڑی سے بڑی جابر طاقت سے پنجہ آزمائی کرنے میں کبھی کوئی خوف نہ ظاہر کیا[۱۳]۔

سلسلۂ ارادت

مولانا آزاد سبحانی مولانا ضیاء الرحمٰن (اناؤ) کے مرید تھے، جو مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی نقشبندی کے خلیفۂ مجاز تھے[۱۴]۔

تلاش معاش

تلاش معاش کی غرض سے کانپور آنا ہوا ۔ یہاں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا[۱۵] اور یہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۸ء کی بات ہے[۱۶]۔

مدرسۂ الٰہیات

آپ فلسفۂ الٰہیات کے فاضل تھے ۔ لہٰذا درس و تدریس کا خاصا چرچا ہوا اور آپ کا بنا کردہ چھوٹا سا مدرسہ بعد میں مدرسۂ الٰہیات کانپور کے نام سے معروف خاص و عام ہوگیا ۔ آپ اس مدرسہ کے بانی تو تھے ہی ، اب شیخ الجامعہ ہوگئے اور یہ مدرسہ ۱۹۱۹ء تک نہایت خوش اسلوبی سے چلاتے رہے ۔ اس کے بعد یہ مدرسہ ان چند تاجران کے ذاتی اختلافات کی نذر ہوگیا جو اس کی مالی امداد کرنے کی وجہ سے انتظامی معاملات میں دخیل تھے[۱۷]۔

ادبی ، سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں

کانپور میں رہتے ہوئے آپ نے ادبی ، سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور آپ کا مدرسۂ الٰہیات ان سرگرمیوں کا مرکز بن گیا . . . یہ وہ دور تھا جب مسیحی پادری اور آریا سماجی مبلّغ خلاف اسلام تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے مارچ ۱۹۰۸ء میں آریا سماجیوں نے بھرت پور کے نو مسلم راجپوتوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش کی ۔ اس کے رد عمل سے مسلمان علماء میدان عمل میں آ گئے ۔ تبلیغی انجمنیں بننے لگیں[۱۸]۔

مسجد مچھلی بازار کانپور

مسجد مچھلی بازار کانپور کے انہدام کے بعد مولانا مسلمانوں کے ہیرو بن گئے ۔ انھوں نے بڑی جرأت مندی سے ایک مسلمان عالم دین اور رہنما کی حیثیت سے کام کیا ۔ مسجد کی شہادت سے مسلمانان کانپور سراپا احتجاج بن چکے تھے ۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد کی سربراہی میں ایک پر ہجوم جلسہ ہوا ، جس پر سرکاری محافظوں کی فائرنگ سے چند نوجوان شہید ہوگئے ۔ مولانا دیگر ایک سو سے زائد افراد کے ساتھ گرفتار ہوئے اور بالآخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو رہا ہوئے[۱۹]۔

مسلم لیگ سے وابستگی

۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا ۔ مولانا آزاد سبحانی اس میں شامل تھے ۔ آپ مسلم لیگ کے ساتھی اور مطالبۂ پاکستان کے زبردست حامی تھے[۲۰]۔ مولانا آزاد سبحانی

نے اس اجلاس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ۔

کانگرس سے علیحدگی

معلوم ہوتا ہے کچھ عرصہ آپ کانگرس سے منسلک رہے یا پھر ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے ، لیکن جب ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک چلائی اور اس تحریک کے دوران گرفتار کیے جانے والے افراد میں مسلمانوں کی تعداد اپنے حصے سے کہیں زیادہ ہوگئی اور ہندوؤں نے اپنی عیاری اور مفاد پرستی کا خوب مظاہرہ کیا، تو مولانا آزاد سبحانی دل برداشتہ ہوکر کانگرس سے علاحدہ ہوگئے اور مسلمانوں کی علاحدہ تنظیم کے لیے تحریک دعوت اور خلافت ربانی کا تصور پیش کیا"[۲۱] ۔

تحریک خلافت

۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری کے جاری کردہ فتاویٰ متعلق بہ جزیرۃالعرب پر آپ نے دستخط کیے تھے ۔ لہٰذا تحریک خلافت میں فعال کردار ادا کیا ۔ مختلف اجلاسوں میں شرکت کی اور جب فروری ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس بمبئی کا اجلاس (شعبۂ علماء) منعقد ہوا، تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے کی اور اسی سال ستمبر میں آل انڈیا خلافت کانگرس کلکتہ کی صدارت کی ۔ وہ یو پی خلافت کمیٹی کے عہدۂ صدارت پر بھی فائز رہے اور ضلعی سطح کی کئی ایک کانفرنسیں منعقد کر کے مسئلۂ خلافت کی اہمیت اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا[۲۲]۔

ترک موالات

تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ عدم تعاون کی تحریک چل نکلی تھی اور برصغیر کے کئی رہنماؤں نے سودیشی کپڑا پہننا لازم قرار دے دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے تو "سودیشی سٹور" کے نام سے دکان کھول لی تھی۔ اسی دور میں مولانا آزاد سبحانی کھدر پہننے لگے تھے اور اس کی دوسروں کو تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کا لباس گاڑھے کا کرتا، اسی کا تہہ بند، اسی کی چادر اور لکڑی کی کھڑاؤں ہوگیا تھا[۲۳]۔

تحریک آزادی

مولانا آزاد سبحانی کو افتادِ طبع سیاست کے خار زار میں لے گئی۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے "ڈانڈی مارچ" کی تائید میں انھوں نے بھی گرفتاری پیش کی، مگر اس عرصے میں کانگرسی رہنماؤں کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کانگرس مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے مطالبۂ آزادی کے قریب آگئے۔ ۱۹۳۵ء سے تحریک قیام پاکستان تک انھوں نے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص پر زور دیا[۲۴]۔

ہندو مسلم اتحاد اور اس کا اختتام

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے مولانا آزاد سبحانی خلافت اور عدم تعاون کے زمانے میں بہت سے دوسرے مسلمان رہنماؤں کی طرح کانگرس کے قریب ہوگئے تھے اور حقیقتاً یہ دور ہی "اتحاد" کا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں یوپی کانگرس کمیٹی کے نائب صدر تھے مگر شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے اس عارضی "اتحاد" کو ختم کر دیا۔

ماہنامہ " روحانیت " کا اجراء

جنوری ۱۹۲۵ء میں مولانا سبحانی نے " روحانیت " (گورکھپور) کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا ، جس نے مسلمانوں کی بے پناہ خدمات سر انجام دیں ، لیکن یہ رسالہ ڈیڑھ برس باقاعدگی سے شائع ہونے کے بعد بند ہوگیا[۲۵]۔

تحریک ربانیت

مولانا آزاد سبحانی نے ۱۹۴۵ء میں "جمعیت ربّانیہ" کے نام سے ایک تحریک کا تصور پیش کیا ، لیکن اس کے لیے وہ حصول پاکستان کو لازمی قرار دیتے تھے ۔ وہ اپنے رسالہ " دعوت " میں مسلمانوں کے الگ وطن کے لیے " اسلامستان در ہالستان " کے زیر عنوان مستقلاً لکھتے رہے تھے[۲۶]۔

تقریر و خطابت

مولانا آزاد سبحانی اپنی تقریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے ۔ دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے تھے۔ سننے والوں کے دل جیت لیتے تھے ۔ ان کی خطابت کے بارے میں منقول ہے کہ :
" تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں ، تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں ، بہت بڑے فلسفی بھی ہیں ۔ تقریر میں فلسفیانہ تخیل و تجزی کے کمالات اور دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں . . . دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ، ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے ۔ جن کے خیالات گرانمایہ ہوتے ہیں وہ " بے زبان " ہوتے ہیں ،

لیکن یہ شخص اقلیم خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستان زبان کا بھی تاجدار"[۲۷]۔

آزاد سبحانی اور ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد سبحانی اپنے معاصر ابوالکلام آزاد ، جو فن تقریر میں اپنی مثال آپ تھے ، سے بھی سبقت لے گئے ۔ منقول ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے کانگرس سے وابستہ ہونے کے سبب مسلمانان کلکتہ نے ان کی اقتداء میں نماز عیدین پڑھنے سے انکار کر دیا ، تو قرعہ فال مولانا آزاد سبحانی کے نام پڑا اور دو سال انھوں نے یہ فرائض انجام دیے[۲۸]۔

حج

غالباً مولانا کا پہلا سفر ۱۹۳۶ء میں حجاز کا تھا[۲۹] ، لیکن مروی ہے کہ ۱۹۳۵ء (ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ) میں آپ نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی[۳۰]۔

مراسلاتی یونیورسٹی کا تصور

مولانا آزاد سبحانی نے "تحریک ربانی" کی ابتدا کے ساتھ ہی دو مختلف جریدے " ربّانیت " اور " دعوت " اپنے فرزند حسن سبحانی صاحب کی نگرانی و اہتمام میں لکھنؤ سے جاری کیے[۳۱]۔ مولانا نے تعلیمی اور دینی تبلیغ کے فروغ کے لیے غالباً سب سے پہلے ہندوستان میں مراسلاتی یونیورسٹی کا تصور پیش کیا اور عملاً اسے کر دکھایا[۳۲]۔

سفر

مولانا آزاد سبحانی کی زندگی سیماب کی طرح گزری ۔ وہ کبھی کسی جگہ جم کر نہ رہ سکے ۔ گو کہ ان کا آبائی وطن سکندر پور بلیا تھا ، لیکن اقامتی وطن گورکھپور بنا لیا تھا ، مگر وہ گورکھپور بھی گاہے گاہے تشریف لے جاتے ۔ ساری عمر سفر اور سیاحی میں گزار دی . . . سفر سے بالکل پراساں نہ ہوتے اور خاص طور سے سیرت کے جلسوں میں ضرور شرکت کرتے ۔ انھوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ایشیا اور یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا ، جس کی وجہ سے ان کے مشاہدات اور تجربات کو بہت استحکام ملا[۳۳]۔ انھوں نے غالباً ۳۴ - ۱۹۳۳ء میں لندن کا سفر کیا تھا اور تقریباً چھ ماہ تک وہاں مقیم رہے[۳۴]۔

قید

پہلی مرتبہ آپ مسجد مچھلی بازار کانپور کے انہدام کے بعد ۱۹۱۳ء میں جیل گئے اور پھر ۱۹۳۶ء میں سفر حجاز سے چند ماہ پیشتر انھوں نے ایسٹ انڈین ریلویز کے ملازمین کے مطالبے کے سلسلے میں ایک تقریر کی تو انھیں لکھنؤ جیل میں قید کیا گیا[۳۵]۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک میں غالباً کوئی اہم سیاسی شخص قید فرنگ میں نہ تھا[۳۶]۔

شاعری

مولانا آزاد سبحانی بلند پایہ شاعر تھے، لیکن سیاست نے انھیں شعر و شاعری سے بے بہرہ کر دیا تھا ۔ ہم ان کا کچھ کلام (جو دستیاب ہو سکا ہے) آخر میں نقل کریں گے ۔

شادی

مولانا آزاد سبحانی نے پندرہ برس کی عمر میں شادی کی ۔ اولاد میں سے ایک بیٹی جمیلہ خاتون اور بیٹے حسن سبحانی کا ذکر اکثر ملتا ہے ، لیکن آپ کی دو اور بھی صاحبزادیاں تھیں[۳۷]۔

بیماری اور وفات

وفات سے چند برس پہلے مختلف امراض نے صحت پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا ۔ ضعیفی بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی، لیکن مولانا کے عزم و حوصلہ میں اب بھی وہی توانائی تھی، جو ان کی جوانی کے وقت تھی . . . قوم و ملت کی خدمت بھی آزادانہ طریقے سے جاری تھی - ۱۹۵۷ء میں ڈیری آنسون (جنوبی بہار) سے سیرت کے جلسہ میں شرکت کی دعوت ملی ۔ شدید گرمی اور لو کی پروا کیے بغیر شریک جلسہ ہوئے ، لیکن واپسی میں لو لگ گئی ۔ بیماری ہی کے عالم میں شمالی بہار کے مقام بگہا گئے ، بیماری بڑھ گئی تو علاج کے لیے لکھنؤ پہنچے ۔ ہسپتال داخل کیے گئے ، لیکن مولانا کو احساس ہو چکا تھا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے ۔ بصد اصرار بیماری کے عالم ہی میں گورکھپور آئے ، چند دنوں بعد ۲۳ جون (۱۹۵۷ء) کا دن گزر چکا تھا کہ رات ایک بجے (یعنی ۲۴ جون کے آغاز میں) گورکھپور کے محلہ نظام پور میں وفات پائی اور اسی محلہ میں کچی باغ گورکھپور میں آسودۂ خاک ہوئے[۳۸]۔ یہ بھی منقول ہے کہ وفات سے دو تین روز پہلے ریل کا سفر کرتے ہوئے زخمی ہوئے اور اس سے علالت بڑھی لیکن یہ واقعہ تحقیق طلب ہے[۳۹]۔

آثار

مولانا آزاد سبحانی سے چند کتابیں یادگار ہیں، جن میں "الکلیات" (فلسفہ) ، مقدمہ تفسیر ربانی ، تفسیر ربانی ، العقائد ، کلیات دین ، زبور ربانی (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) ، سیرت محمدی[۳] (اس کا بنگلہ ترجمہ اسلامک فاؤنڈیشن نے شائع کیا تھا) ، سفرنامہ یورپ اور امریکہ ، ارکان خمسہ ، فلسفۃ الربانیہ (عربی) قابل ذکر ہیں ۔ ایک کتاب " مقدمہ علم القرآن " کے نام سے بھی عبد العزیز ربانی نے "کتابستان ، محمد بن قاسم روڈ ، کراچی" سے شائع کرائی تھی ۔ مولانا نے انگریزی میں بھی کئی رسالے لکھے ہیں، جن میں سے ایک "The Teaching of Islam in the Light of Rabbaniyat" امریکہ میں شائع ہوا[۳]۔ علاوہ ازیں سیاست میں دو رسالے : ۱۔ " آزادی مالا ہار " اور ۲ ۔ " موپلا " بھی لکھے[۳۱]۔

حواشی باب اول

۱ ۔ تحقیقات اسلامی : مقالہ بعنوان "مولانا آزاد سبحانی ، حیات و نظریات" از ڈاکٹر اقبال حسین (علی گڑھ ۔ مارچ ۱۹۸۵ء ۔ مدیر سید جلال الدین عمری) ۔ ۱۰۱ ، العلم : مقالہ بعنوان "مولانا آزاد سبحانی" از محمد صادق قصوری (کراچی ۔ شمارہ اپریل

تا جون ۱۹۸۱ء) ۔ ۱۱ ، شب چراغ : از حکیم نثار احمد علوی ، ہ کوری اکیڈمی ، کراچی ۔ ۱۱۷ ، ماہنامہ کتابی دنیا : مقالہ بعنوان "مشاہیر ہند" از خواجہ حسن نظامی (کراچی ۔ جنوری ۱۹۶۷ء) ۔ ۲۲ ، Francis Robinson, *Separatism Among Indian Muslims*, p. 426

۲ ۔ تحقیقات : ۱۰۱

۳ ۔ ایضاً ، Francis : p. 426, A. N. Jain, *Muslims in India, A Biographical Dictionary*, Vol : I, p 108

۴ ۔ تحقیقات : ۱۰۰

۵ ۔ ایضاً : ۱۰۳

۶ ۔ تاریخ ہند و پاک از مولانا قاری احمد پیلی بھیتی ، کراچی ۔ ۱۹۷۳ء ۔ ۳۷۰ ، العلم : ۱۱

۷ ۔ ایضاً

۸ ۔ تحقیقات : ۱۰۲

۹ ۔ ایضا

۱۰ ۔ ایضاً : ۱۰۳

۱۱ ۔ ایضاً

۱۲ ۔ ایضاً

۱۳ ایضاً

۱۴ ۔ ایضاً : ۱۰۲ (حاشیہ)

۱ ۔ ایضاً : ۱۰۳

۱۶ ۔ ماہنامہ نقوش ، لاہور ، مکاتیب نمبر ۔ ۹۳۰ ، العلم : ۱۱

۱۷ ۔ تحقیقات : ۱۰۳

۱۸ ۔ ماہنامہ نقوش : ۹۳۰ ۔ لعلم : ۱۱

۱۹ - Francis : p. 215 ، تحقیقات : ۱۰۳ - ۱۰ ، حیات شبلی : مصنفہ سید سلیمان ندوی ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء ۔ ۶۰۱ - ۶۰۲ ، دید و شنید : مصنفہ رئیس احمد جعفری ، لاہور- ۱۹۴۸ء - ۵۸ - ۶۰ ، اعمال نامہ از سر رضا علی ، دہلی - ۱۹۴۹ء - ۳۱۰ ، داستان یا دستان از چودھری نذیر احمد خان ، لاہور ۱۹۷۶ء - ۳۱ ، اوراق گم گشتہ از رئیس احمد جعفری ، کراچی - ۱۹۷۱ء - ۱۳ ، برگ گل (مجلہ) اردو کالج ، قائد اعظم نمبر کراچی ۱۹۷۲ء - ۱۴۸ - ۱۵۰ ، ہفت روزہ المدینہ ، کراچی ۷ ، اگست ۱۹۷۱ء ، العلم : ۱۱ - ۱۲

۲۰ - تحقیقات : ۱۱۲

۲۱ - ایضاً : ۱۱۱ ، شب چراغ : ۱۲۲ ، العلم : ۱۳ ، تاریخ ہند و پاک : ۳۷۱

۲۲ - شب چراغ : ۱۲۰ ، فاؤنڈیشن آف پاکستان ، ج ۱ ، شریف الدین پیرزادہ ، نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی (۱۹۶۹ء) - ۵۶۳ - ۵۶۵ ، نامہ اعمال ، ج ۱ ، مصنفہ سر محمد یامین ، لاہور - ۱۹۷۰ء - ۳۰۲ ، العلم : ۱۶

۲۳ - شب چراغ : ۱۲۰ ، تحقیقات : ۱۱۰ - ۱۱۱ ، العلم : ۱۱ ، ۱۶

۲۴ - تاریخ ہند و پاک : ۳۰ ، (ہفت روزہ) صوت الاسلام ، لاہور (ترجمان دیو بندی تھانوی گروپ) ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء - ۹ ، العلم : ۱۷

۲۵ - ماہنامہ معلومات، لاہور ، شمارہ نمبر ۱۵ ، العلم : ۱۳

۲۶ - تحقیقات : ۱۱۵ . تاریخ ہند و پاک : ۳۷۱ ، العلم : ۱۷

۲۷ - دید و شنید : ۵۸ - ۶۰

۲۸ - ذکر آزاد از عبدالرزاق ملیح آبادی ، کلکتہ - ۱۹۶۰ء - ۲۱۹ - ۲۲۰ ، العلم: ۱۳ ، چند یادیں از خواجہ جمیل احمد، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ، ۱۹۷۷ء - ۱۱۷

۲۹ - تحقیقات : ۱۱۵

۳۰ - معین المنطق از مولانا معین الدین اجمیری ،کراچی - ۱۹٦۷ء
۹٦، العلم : ۱٦

۳۱ - تحقیقات : ۱۱۵

۳۲ - ایضاً

۳۳ - ایضاً : ۱۱۵-۱۱۷

۳۴ - چند یادیں : ۱۱٦

۳۵ - تحقیقات : ۱۱۵

۳٦ - ایضاً (حاسیہ)

۳۷ - انٹرویو ڈاکٹر این اے بلوچ از محترمہ ناظرہ خاتون

۳۸ - ایضاً ، تحقیقات : ۱۱۷ - ۱۱۸

۳۹ - العلم : ۱٦ ، تاریخ ہند و پاک : ۳۷۱

۴۰ - تحقیقات : ۱۱۷

۴۱ - شب چراغ : ۱۲۱

مولانا آزاد سبحانی اور تحریک پاکستان

ہمارے اسلاف نے بے شمار قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی ۔
تحریک آزادی کی سینکڑوں شخصیات ابھی تک پردہ اخفاء میں ہیں
اور ان گنت ایسے بھی لوگ ہیں، جن کے کارہائے نمایاں تا حال یکجا
نہیں کیے گئے ۔ مؤرخین ، ناقدین ، ادباء اور شعراء سبھی کو چاہیے
کہ ملّی جذبہ اور حب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنے
محسنوں کی زندگیوں کے روشن پہلووں کو اجاگر کریں ۔ مولانا
آزاد سبحانی ان گنے چنےسیاسی اور مذہبی رہنماؤں میں سے ہیں، جنھوں
نے تحریک آزادی میں بھر پور حصہ لیا :

"ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مابعد
اثرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ مغلوں کے آخری بادشاہ
بہادر شاہ ظفر کی برطرفی نے ہندوستان پر برطانوی حاکمیت
مکمل کر دی تھی ۔ ملک کی سیاسی ، معاشی ، معاشرتی ،
مذہبی اور سماجی زندگی پر انگریزی تہذیب و تمدن کے اثرات
تیزی سے نمایاں ہونے لگے تھے ۔ اس کے خلاف ہندوستان کے
باشعور افراد اور جماعتیں آہستہ آہستہ صف آرا ہونے لگی تھیں،

جس کی وجہ سے ملک میں مختلف سماجی، مذہبی اور تمدنی تحریکات نے جنم لیا۔ اس صدی نے ہندوستان کو ان گنت عظیم سیاسی اور مذہبی مصلح اور رہنما فراہم کیے جو قومی اور ملّی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے (مسلمان) رہنماؤں میں ۔۔۔ سید احمد بریلوی شہید، شاہ اسماعیل شہید دہلوی، بدرالدین طیب جی، سید امیر علی، مولوی کرامت علی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا فضل حق بدایونی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی، شوکت علی، محمد علی جناح، آزاد سبحانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد بدایونی اور بہت سے دوسرے سر فہرست نظر آتے ہیں"[۱]۔

مولانا آزاد سبحانی کی سیاسی بصیرت

مولانا آزاد سبحانی ایک بلند پایہ عالم دین، فلسفی، ادیب اور شعلہ بار مقرر تھے۔ ان کی سیاسی و علمی زندگی میں ۲۳ - ۱۹۲۲ء کے سال ان کی مقبولیت کے سال تھے۔ ان کو تاریخ مذہب، اسلامیات اور فلسفۂ سیاست پر مکمل عبور تھا[۲]۔ اس دور کے سیاسی اجلاسوں میں مولانا آزاد سبحانی کی آمد سے سیاست کے بے جان موضوع میں جان پڑ جاتی تھی اور حاضرین مجلس پر مولانا کے تبحر علمی اور انداز گفتگو کا گہرا نقش پڑتا تھا[۳]۔

مولانا آزاد سبحانی کی سیاست میں سرگرمی

"ہندوستانی مسلمان انیسویں صدی کے وسط سے جس سیاسی و معاشی استحصال کا شکار ہوئے وہ اظہرمن الشمس ہے۔ برطانوی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ملک کے گزشتہ فرمانرواؤں کے ہم مذہبوں کو مفلوج کر دیا جائے، تاکہ وہ سیاسی اور معاشی طور پر نہ سنبھل سکیں۔ اس سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر، اکابرین حکومت برطانیہ، مسلمانوں کے ساتھ گاھے "نرم" اور گاھے "گرم" سلوک اختیار کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال، بظاہر مسلم جذبات کو مطمئن کرنے کی ایک کوشش تھی، لیکن حقیقتاً برطانوی حکومت کا مدعا قومی تحریک کو کمزور کرنا تھا۔ بنگالی مسلمانوں کو فراہم کردہ یہ رعایت بھی ۱۹۱۱ء میں واپس لے لی گئی[۲]۔ مسلم لیگ نے۔۔۔ اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاجات کیے، ملک میں مسلمان ابھی اس کے خلاف اظہار غم و غصہ میں مصروف ہی تھے کہ وہ جنگ بلقان اور اٹلی کی روضۂ نبوی[۳] اور خانۂ کعبہ پر بمباری کرنے کی دھمکی سن کر اور مضطرب ہو گئے[۵]۔ علمائے کرام، بالخصوص مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علی برادران، شیخ مشیر حسین قدوائی اور دیگر اکابرین ملت کی کوششوں سے بالآخر ۱۹۱۳ء میں خدام کعبہ کی بنیاد پڑی[٦]۔ مولانا آزاد سبحانی کانپور میں "خدام کعبہ" کے سرگرم رکن، شیدائی اور بعد ازاں روحِ رواں بن گئے"[۷]۔

مسجد مچھلی بازار کانپور اور مولانا آزاد سبحانی

مولانا آزاد سبحانی سیاسی بصیرت تو رکھتے ہی تھے، اب

انھوں نے مدرسۂ الٰہیات کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کا عہد کر لیا اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے بے پناہ قربانیاں دینے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ مولانا آزاد سبحانی ہمہ تن دینی اور تدریسی کاموں میں مصروف تھے کہ کانپور میں ایک ایسا حادثہ ہوا جس سے پورا برصغیر متاثر ہوا اور مولانا مسند درس سے اٹھ کر مکمل طور پر میدان سیاست میں آ گئے۔ میونسپل کمیٹی کے کارپردازوں نے ایک سڑک بنانے کی خاطر مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا کچھ حصہ منہدم کرا دیا، جب کہ ایک مندر کو انہدام سے بچانے کے لیے سڑک کے نقشہ میں تبدیلی کر دی گئی تھی۔ مسجد کی شہادت سے مسلمانان کانپور سراپا احتجاج بن گئے۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد کی سرکردگی میں ایک بڑا جلسہ ہوا۔ جلسہ کے اختتام پر ہجوم نے مسجد کا رخ کیا اور منہدم دیواروں پر اینٹیں چننے لگے۔ قانون کے محافظوں نے گولی چلا دی اور چند نوجوان خون میں لت پت ہو گئے۔ اس خونیں حادثے کی بازگشت پورے ملک میں سنی گئی۔ اخبارات نے سراپا احتجاج اداریے لکھے اور جگہ جگہ حکومت کے رویے پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی۔ مولانا آزاد سبحانی اور ایک سو سے زائد دوسرے افراد گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے سرکردہ مسلمان رہنماؤں نے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آخر ایک معاہدہ کے تحت مسجد کا مسمار کردہ حصہ تعمیر ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد رہا ہوئے [۸]۔

جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب نے اپنے مفصل مقالہ میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

"جنگ بلقان ابھی جاری ہی تھی کہ مسلمانان ہند کو ایک نئے سانحہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کو حکام کانپور کے ایما سے منہدم کرکے سڑک (سٹن روڈ) کا جز بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کی فریادیں، مظاہرے، احتجاجات سب نظر انداز کر دیے گئے۔ مسلمانوں کے غم و غصہ کے بارے میں حکام بالا (مرکزی سرکار) کو غلط اطلاع دی گئی اور صوبائی گورنمنٹ نے یہ اعلامیہ جاری کر دیا کہ مسجد کے معاملہ میں مسلمانان کانپور میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ صوبائی حکومت اور مقامی حکام کے طرز عمل سے مسلمانان کانپورکو سخت صدمہ پہنچا۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد سبحانی نے عید گاہ (کانپور) کے میدان میں پچاس ہزار فرزندان توحید کے سامنے ایک مدلل، بصیرت افروز اور پرجوش تقریر کی۔ آپ نے حکام شہر اور صوبائی حکومت کے الزامات کی تردید کی کہ مسلمانوں میں جوش و خروش اور مسجد کے لیے موجودہ ہیجان سلطان ترکی کی در پردہ معاونت کی وجہ سے ہے"[۹]۔

مولانا کی تقریر خاصی طویل ہے، اس کے بعض اجزاء قارئین کرام کے مطالعہ کے لیے نقل ہیں تا کہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ مولانا کی اصل طاقت اور اساس کیا تھی:

"۔۔۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو آج کن الفاظ سے یاد کروں، آپ کو مسلمان کہوں کہ آپ کو محمد عربی[ص] کا عاشق

یا آپ کو اسلام کے شیدائی کے نام سے یاد کروں ۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ جتنی خوبیاں ہیں وہ سب خدا کی ہیں آپ خدا کے پیرو اور اس کے آخری نبیؐ کے ماننے والے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
مسلمانان کانپور ! اس سے پہلے ۲۳ جولائی کو آپ لوگوں کا ایک جلسہ اسی سر زمین پر اس بات کے عرض کرنے کے لیے قائم کیا تھا کہ گورنمنٹ ہمارے جوش کو سچ اور صحیح تسلیم کر لے ۔ مسلمانوں نے مختلف تقریروں میں نہایت ادب ، سکون اور خاموشی کے ساتھ اسلامی شرافت اور سنجیدگی کے ساتھ اس امر کو ثابت کر دیا ۔ زور سے ، شور سے ، ہر طرح سے ۔ ۔ ۔ دکھا دیا کہ مسلمانوں کو دلی رنج و ملال ہے ، مگر میرے دوستو ! مجھے توقع ہے کہ گورنمنٹ ہمارے جلسہ کی کارروائی اس قدر جھوٹی نہ مانے گی ۔ ۔ ۔ جب سرکاری مراسلہ لیفٹیننٹ گورنر کی طرف سے شائع ہوا اس میں نہایت بیدردی سے کہا گیا ۔ ۔ ۔ کہ اب مسلمانان کانپور میں کوئی جوش نہیں ہے، وہ جھوٹے اور ان کے علماء جھوٹے، ان کا مذہب جھوٹا ، ان کی مسجد جھوٹی ، ان کی تمام ساخت جھوٹی ۔ آپ یقین رکھیے کہ ہم مذہب کے لیے پیدا ہوئے ، ہمارے رسولؐ نے ہم کو فرمان دیا تھا کہ تم پر کوئی مصیبت آئے تو کبھی غمزدہ نہ ہونا (آہ و نالہ نہ کرنا) ۔ میرے دوستو ! یہ مسلمان بتائیں گے کہ ہم میں پھر جوش پیدا ہے ۔ ۔ ۔ ہر شخص ۔ ۔ ۔ ہماری حالت اس وقت دیکھ کر یقین کر لے گا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ اسلام کے شیدائی ہیں ۔ وہ مسلمانوں کو زمین سے آسمان اور آسمان سے کنگرۂ عرش پر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ باوجود

اس بات کے کہ گھر خالی ہو گئے ہیں ، باوجود اس کے کہ آنسو آپ کی آنکھوں سے خشک ہو گئے ہیں ، بدن میں رعشہ پیدا ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ مگر خدا کی قسم اور قسم اس کی جس کا نام اس جھنڈے پر ہے ، یہ پہلی منزل ہے ، ہم محض آہستہ آہستہ چلنے کے عادی ہیں ، ہم شروع سے تہذیب لے کر آئے ہیں ، ہم مسلمانوں میں یک دم جوش نہیں پیدا ہوتا ۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے پیشوا سردار دو جہاں رسول ؐ کو مشرکین مکہ ۔ ۔ ۔ نماز میں ان پر اینٹیں پھینکا کرتے تھے۔ دس برس بعد جب وہ بادشاہ ہوئے ، انصاف کے سلطان نے نیام سے تلوار نکالی ، قریشیوں میں تہلکہ مچ گیا ۔ ۔ ۔ چین سے بڑے بڑے سورما جو گھروں میں بیٹھ گئے (تھے) انھوں نے رسول ؐ کے قدموں میں اپنے تئیں ڈال دیا ۔ پس یاد رکھو ، ہماری رگوں میں بھی نبی و رسول ؐ کا اثر ہے ، اس واسطے ہم ہمیشہ سست چلیں گے ۔ ہم سب سے پہلے امن پھیلانے آئے ۔ عیسائی (یعنی انگریز) جھوٹے ہیں ۔ اگر وہ امن کے ضامن ہوتے تو وہ بلقان کی زمین خون سے رنگین نہ کرتے ۔ اگر عیسائی (گورنمنٹ) امن کی ضامن ہے تو وہ سنگین لے کر آپ کی مسجد پر نہ آتی اور مسٹن خونریزی کے جوش میں اول اس اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے کہ یہ جوش نہیں ہے ۔ کیا اس کے بعد خونریزی باقی نہ رہ گئی ۔ میں کہتا ہوں کہ امن کا ضامن ایسا نہیں ہے کہ اٹلی اور ترکی کی طرح سے اپنی تلوار کو نیام میں نہ ڈالر ۔ ۔ ۔ ہم چونکہ امن کے ضامن ہیں اس

واسطے ہم ہر معاملہ کو بڑی سمجھ سے کرتے ہیں - ہم سب سے پہلے امن کا جھنڈا بلند کریں گے - ہم سب سے پہلے مذہب کی عظمت اور خصوصیت پیدا کریں گے - - - جارج کی طاقت ہو یا زار کی یا مسٹن کی ہمارا کام تکبر نہیں روک سکتا - جب مذہب اور حکومت دونوں ایک اکھاڑے میں اتریں گے ، تو ہم مذہب کے ساتھ ہوں گے - - - بہت سے میرے دوستوں نے یہ کہا کہ انگریز یہ سمجھتے ہیں کہ سلطان ترکی کی امداد چونکہ موجود ہے اس واسطے ہندوستان کے مسلمان گستاخ ہو گئے ہیں - مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کا ہر فرد جب تک وہ نماز کا پابند ہے اور جب تک خدائے ذوالجلال کے اجلاس میں سر جھکاتا ہے، اس وقت تک نہ وہ سلطان ترکی کا محتاج ہے اور نہ جارج پنجم کا دست نگر ، وہ صرف خدا کا مطیع ہے - - - پس میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کی اطاعت کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم پاؤں پھیلا کر سوئیں ، وہ ہمارا پہرہ دیں - اس سے زیادہ قسم خدا کی مسلمان اطاعت کا مفہوم نہیں سمجھتے ہیں - ان معنوں میں ہم مطیع ہیں - اطاعت کرتے ہیں - گورنمنٹ یاد رکھے کہ جب تک گورنمنٹ اس فرض (یعنی تحفظ عوام) کو قائم رکھے گی ہم باہر نہیں نکلیں گے - دوسری حیثیت سے گورنمنٹ پر ہم حکومت کرتے ہیں - اول وہ فرض ہے جو نبی ؐ نے ہمارے کانوں میں پھونک دیا ہے وہ ہے ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“- یاد رکھو ہم کلمہ کے ذریعہ سے ان پر حکومت کرتے ہیں - اس وقت تک یاد رکھو ہم تمام دنیا کے لوگوں کو اسلام کے

جھنڈے کے نیچے جمع کریں ۔ دین میں طاقت ہے ۔ ہمیں خود جھنڈے کے نیچے جمع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ نے نہایت شد و مد سے فرمایا ہے کہ اے محمد رسول ص میں نے تم کو دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم آزمائش کرتے پھرو ، میں نے اس لیے نہیں بھیجا کہ اپنے حجرہ میں بیٹھے رہو ۔ ۔ ۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جناب محمد رسول ص کو ہمارے تیقن اور تلقین کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ اس لیے کہ تمام دنیا میں اپنے دین کو غالب بنائیں ۔ وہ سر مقدس جو عرب کے سامنے جھکتا تھا ، جو بوڑھے بھیک مانگتے کے سامنے جھکتا تھا ۔ وہ سر جس میں کبھی رتبہ کا دورہ نہیں پہنچا (پڑا ؟) قسم خدا کی ہے ، جب وہ کسریٰ کے سامنے جاتا ہے ۔ ۔ ۔ کسریٰ اپنے تخت پر لوٹتا ہے، قیصر اپنے محل میں کانپتا ہے ، ان کی شان و جاہ و جلال خاک میں مل جاتی ہے ۔ مسلمانوں میں وہ غرور نہیں ہوگا کہ گورا رنگ ہونے سے انگریزوں کے اور ہندوؤں کے ہندو ہونے سے ظلم کریں ۔ ان میں وہ غرور ہے کہ ہمیشہ کلمہ پر قائم رہیں ۔ جب جب مسلمانوں نے جوش دکھایا ہے وہ نیچرل اور قدرتی ہے"[۱۰]۔

مولانا آزاد سبحانی کی اس تقریر سے ان کے تبحر علمی اور یاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ہندوستان کی سیاست پر س قدر عبور تھا اور انھوں نے کس جرأت اور بیباکی سے حاکم نت کو مسلمانان ہند کی طرف سے للکارا ۔ خواجہ جمیل احمد ‛ھتے ہیں :

"مولانا آزاد سبحانی کی ولولہ انگیز تقریر نے مسلمانوں میں آگ لگا دی اور مسجد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو گئے ۔ مسلمان مرد ، عورتیں ، بچے مسجد میں جمع ہو گئے ۔ وہ مسجد چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے ۔ جس پر ٹائگر Tiger نامی مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا ۔ ۔ ۔ سینکڑوں مسلمان مرد ، عورتیں ، بچے شہید ہوئے ۔ اس کے بعد گرفتاریاں شروع ہوئیں ۔ مولانا آزاد سبحانی بھی گرفتار ہوئے ۔ اس سانحہ نے سارے ملک میں ہیجان برپا کر دیا ۔ سر جیمس مسٹن اس وقت یو پی کے لفٹیننٹ گورنر تھے ۔ مسلمانوں نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کی جس میں ملک کے نامور مسلمان قانون دان شامل تھے ۔ ان میں سر شاہ محمد سلیمان ، مظہرالحق ، ناظر حسن بیرسٹر لکھنؤ اور سر راس مسعود خاص طور سے قابل ذکر ہیں مولانا محمد علی ایک مشن کے سربراہ کی حیثیت سے لندن گئے اور انھوں نے انگریز عوام کو اس سانحہ سے متعلق ظلم و تشدد سے آگاہ کیا ، جس سے حکومت برطانیہ سخت پریشان ہوئی ۔ گرفتار ہونے والوں کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا ۔ مرنے والوں کو خاطر خواہ معاوضہ دیا گیا اور مسجد ڈھانے کے بجائے سڑک کا فٹ پاتھ مسجد کے نیچے تعمیر کیا گیا ۔ اوپر مسجد کا وضو خانہ تھا اور نیچے فٹ پاتھ ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس سانحہ پر ایک معرکہ آرا نظم لکھی جس کا ایک مصرع ہے :

ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں"[11]

اس واقعہ سے مولانا آزاد سبحانی کو بڑی شہرت ملی ، لیکن انھوں نے بڑی صعوبتیں بھی برداشت کیں :

"مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان گیا تاکہ حکومت برطانیہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا جا سکے۔ اس وفد میں مولانا محمد علی جوہر اور وزیر حسن (جو بعد میں جج بنے) شامل تھے ۔ ان کی کوششوں سے لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے) اور سر علی امام (لاء ممبر) کانپور پہنچے اور اس مسئلہ کا تصفیہ کیا ۔ حکومت نے آزاد سبحانی کو معافی نامہ پیش کرنے کی شرط پر رہائی کا پیغام بھیجا ، مگر انھوں نے اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے ٹھکرا دیا اور قید و بند کی صعوبتوں کو گلے لگایا ۔ آپ کی جائیداد کو نیلام کر دیا گیا ۔ مولانا نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا، مگر راہ حق کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا"[۱۲]۔

مچھلی بازار کی مسجد کے مذکورہ واقعہ سے مولانا آزاد سبحانی کی شخصیت پورے ملک میں متعارف ہو گئی ۔ اخبارات میں ان کے پر عزم رویے کی تعریف کی گئی ۔ اس کے بعد مولانا سبحانی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے ۔ انجمن خدام کعبہ میں شامل ہوئے اور کانپور میں وہی اس انجمن کے کرتا دھرتا تھے ۔ فروری ۱۹۱۳ء میں انھوں نے یو پی کے مشرقی حصہ اور بہار کا دورہ کیا تھا[۱۳]۔

مسلم لیگ اور مولانا آزاد سبحانی

مولانا آزاد سبحانی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی ، وہ تحریک خلافت ، تحریک ربانی اور تحریک عدم تعاون جیسی کئی تحاریک میں

بھرپور حصہ لیتے رہے ۔ سیاسی تحاریک کانگرس اور مسلم لیگ میں بھی وہ شامل رہے ۔ آپ کو مسلم لیگ کا ساتھی اور مطالبۂ پاکستان کا زبردست حامی سمجھا جاتا تھا ۔ سب سے پہلے مسلم لیگ کے گیارھویں سالانہ اجلاس دہلی میں شامل ہوئے [۱۴] ۔ یہ دسمبر ۱۹۱۸ء کی بات ہے ۔ علماء نے اجلاس کے ایک دن پہلے ۲۹ دسمبر کو فتحپوری مسجد میں غور و فکر کیا اور فیصلہ کیا کہ دینی معاملات و مسائل پر انھیں مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے ۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، ابراہیم سیالکوٹی ، ثناء اللہ امرتسری ، احمد سعید ، مفتی کفایت اللہ، مولانا آزاد سبحانی (جو مفتی صاحب موصوف کے ہمراہ تشریف لائے تھے) اور عبدالماجد بدایونی اور دیگر کئی علمائے کرام نے شرکت کی ۔ مسلم لیگ کے صدر جلسہ شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق تھے ۔ ۳۰ - ۳۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اجلاس ہوئے ۔ مسلم لیگ کے صدر نے علماء کی شرکت اجلاس پر ان کا شکریہ ادا کیا اور توقع ظاہر کی کہ علماء حسب سابق دینی امور میں رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے ۔ مولانا آزاد سبحانی نے اس اجلاس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ۔ اس اجلاس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے ، جن کا خطبہ گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا تھا ۔ مسلم لیگ کے لیڈر علمائے کرام کی شرکت سے بہت خوش ہوئے ۔ ان علماء نے زبردست تقریریں کرکے ایوان فرنگ میں لرزہ طاری کر دیا ۔ اس اجلاس میں خلافت ، بیت المقدس اور اسلامی سلطنتوں کی تقسیم کی تجاویز مذہبی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل تھیں [۱۵] ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ مولانا آزاد سبحانی
لافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے دوران مسلم لیگ کی
گرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ گو ان کی زیادہ توجہ مذکورہ
ریک کی جانب تھی، لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ مولانا اس دور میں
گرس کی طرح مسلم لیگ سے بھی بیزار ہو گئے تھے[16]۔ اس
ے میں ہم سر محمد یامین کا یہ قول پیش کر سکتے ہیں کہ:

”مولانا آزاد سبحانی نے مسلم لیگ کے لیے گرانقدر خدمات
سرانجام دیں“ [17]۔

”وہ (مولانا آزاد سبحانی) مسلم لیگ کی خصوصی کمیٹیوں کے
ن رہے“ جیسا کہ سید شمس الحسن سابق سیکریٹری جنرل
پی صوبائی مسلم لیگ و کونسلر آل انڈیا مسلم لیگ بیان
تے ہیں:

”یو پی صوبائی مسلم لیگ کونسل نے ایک متفقہ قرارداد کے
مطابق ریاست کے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک
کمیٹی مقرر کی تھی، جس میں کونسل نے مولانا آزاد سبحانی،
چودھری خلیق الزمان، نواب محمد اسمعیل خان اور مجھے نامزد
کیا۔ اس کمیٹی کا پہلا اور واحد اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ
کے ہال میں ہوا تھا جس میں سب ارکان نے شرکت کی، لیکن
کمیٹی کے دوسرے اجلاس سے پہلے ہی ملک تقسیم ہو گیا“ [18]۔
آپ کی مسلم لیگ سے وابستگی اور تحریک آزادی کی بے پناہ

خدمات کے ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں میاں ظفیر احمد صاحب کے رشحات قلم کو بھی پیش کیا گیا ہے کیونکہ :

"میاں ظفیر احمد ان چند افراد میں سے ہیں، جنھوں نے مولانا (آزاد سبحانی) کو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۵ء تک دور اور نزدیک سے دیکھا سنا اور پرکھا ہے ۔ یہ ایک طویل مدت ہے اور کسی بھی ذہین فرد کے لیے کسی کو اچھی طرح سمجھنے، اس کے افکار اور نظریات کو پرکھنے کے لیے ، ایک معقول عرصہ ہے ۔ میاں ظفیر احمد نے مولانا کو جس دور میں دیکھا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اس صدی کی سیاسی زندگی کا غالباً مشکل ترین دور ہے ۔ مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ قومی اور بین الاقوامی سیاست . . . . میں شامل ہو چکا تھا . . . . مولانا . . . ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کے حامی بن گئے . . . . نظریۂ پاکستان کی حمایت نے اکابرین مسلم لیگ کو مولانا کی طرف راغب کیا ۔ نواب محمد اسماعیل کی وساطت سے مولانا کی دوبار محمد علی جناح صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں"[19]۔

مذکورہ بالا تحریر اور دوسری تاریخی یادداشتوں سے یہ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد سبحانی مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے ، لیکن یہ بات درست ہے کہ انھیں مسلم لیگ کے جاگیردارانہ غلبہ سے اختلاف تھا[20] اور شاید اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح صاحب سے دوبار ملاقات کرنے کے باوجود بھی مولانا

آزاد سبحانی بدستور اپنی آزاد روش پر قائم رہے اور مسلم لیگ کی سیاست سے کوئی مفاہمت نہ کر سکے[۲۱]۔

مولانا آزاد سبحانی مسلم لیگ کے حامی تھے اور بعض اختلافات رکھنے کے باوجود اس کی حمایت سے کنارہ کش نہ ہوئے۔ ملاحظہ فرمائیں :

"۱۹۴۶ء میں ایک طرف فرقہ وارانہ فسادات اور دوسری طرف مسلم لیگ اور کانگرس کی سیاسی چپقلشیں مولانا کو ذہنی انتشار میں ڈالتی گئیں۔ بالآخر وہ مسلم لیگ سے اختلافات کے باوجود مسلم لیگ کی سیاست سے بہت قریب آ گئے"[۲۲]۔

"مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۲۰ء منعقدہ ناگپور) میں انھوں نے حکیم محمد اجمل خاں کی پیش کردہ قرارداد کی بھرپور تائید کی"[۲۳]۔

جمعیۃ العلماء ہند سے وابستگی

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک پر جمعیۃ العلماء (ہند) کی تاسیس کا ایک جلسہ نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ہوا[۲۴]۔ دوسرے ماہ امرتسر میں باقاعدگی سے اس کا پہلا اجلاس بھی منعقد ہوا[۲۵]۔ مولانا آزاد سبحانی دیگر علماء کی طرح جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں سرگرم عمل رہے، لیکن بعد میں جمعیۃ العلماء کی کارکردگی سے وہ مطمئن نہ رہ سکے۔ روز افزوں اختلافات کی بنا پر وہ جماعت (جمعیۃ العلماء ہند) سے کنارہ کش ہوگئے[۲۶]۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں رکھی گئی ۔ اس کے بانیوں میں مولانا محمود حسن بھی شامل تھے جو ایک مقتدر دینی و سیاسی رہنما تھے ۔ گو علمائے فرنگی محل اور ندوۃ العلماء کے رفقاء نے بھی اس میں شرکت کی، مگر دیوبند کا اثر بہت ہی زیادہ طاقت ور رہا ۔ ۔ ۔ ۱۹۴۵ء میں علمائے دیوبند کی مختلف الرائے جماعت اور دوسرے علماء جن میں مولانا آزاد سبحانی بھی شامل تھے ، نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت جمعیت علمائے اسلام کی طرح ڈالی ، جس نے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی ۔

جمعیۃ العلماء ہند سے علیحدگی اور جمعیت الاسلام سے وابستگی

جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف ۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں جمعیت علمائے اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ اس نئی جماعت کا مقصد حصول پاکستان کے لیے مسلم لیگ کی مکمل تائید و حمایت تھا ۔ مولانا آزاد سبحانی نے اس کے تاسیسی اجلاس کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے بھرپور سعی کی اور بعدازاں اس کے پلیٹ فارم سے مرکزی رہنما کی حیثیت سے مطالبۂ پاکستان کو ایک ولولۂ تازہ بخشا ۔ یہاں تک کہ برصغیر کے مسلمانوں کو خورشید تاباں سے بھی روشن منزل ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مل گئی[۲۷] ۔

مولانا آزاد سبحانی نے جمعیۃ العلماء ہند کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے "جمعیت الاسلام" کی بنیاد ڈالی ۔ جمعیت الاسلام کا پہلا

اجلاس ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ مولانا اس کے پہلے صدر تھے۔ اپنی طویل تقریر میں مولانا نے جمعیۃ العلماء ہند پر شدید تنقیدیں کیں۔ قومی سیاست کی حامی جمعیۃ العلماء (ہند) کی مولانا نے جو مخالفت کی اس کی وجہ سے بنگال میں مسلم لیگ کا زور بہت بڑھ گیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اثرات کم ہو گئے[۲۸]۔

جمعیت علماے اسلام کی داغ بیل ڈالنے والی ممتاز شخصیات میں مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک باقاعدہ مہم شروع کی جس کے ذریعے مسلم لیگ کے رہنماؤں کو حقیقی اسلامی تعلیمات کی ترغیب دی اور "مجلس دعوت الحق" کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی، جس کا تنظیمی ڈھانچہ بھی اپنی ہی نوعیت کا تھا جو محلہ اور گاؤں سے شروع ہوتا تھا۔ اس کا مقصد مسلم معاشرے کی عمومی اصلاحات کے علاوہ پارٹی (مسلم لیگ) کے مغرب زدہ ذہنوں کو اسلامی بنانا تھا۔

مولانا تھانوی نے کانگرس کی شدید مخالفت کی اور اکتوبر ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کی حیثیت سے اس لیے استعفاء دے دیا کہ دارالعلوم میں کانگرسی فکر کو رائج کرنے کی سعی و کوشش کی جا رہی تھی اور مولانا اس کے شدید مخالف تھے۔

مولانا تھانوی نے دارالعلوم دیوبند چھوڑا تو کئی علماء نے ان کی پیروی کی اور دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہہ دیا۔ پھر ہمسفر علماء "جمعیت علماے ہند کانپور" کے نام سے ایک نئی جماعت

کاقیام عمل میں لائے ۔

جونہی جمعیۃ العلماء ہند کانگرس کے قریب ہونا شروع ہوئی تو ان علماء نے جو اس نظریے سے اختلاف کرتے تھے ، اس چیز کی ضرورت کو محسوس کیا کہ اس کا مؤثر طریقے سے جواب دینا چاہیے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ امر شرعی لحاظ سے بالکل غلط ہے کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس کے ساتھ تعاون کیا جائے اور اس کی قوت میں اضافہ ہو ۔ اس تحریک نے جمعیۃالعلماء ہند کےخلاف ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی اور مسلم لیگ نے اس تنظیم کی خوب مدد کی ۔

اس تنظیم سے جنھوں نے بھرپور تعاون کیا ان میں مشائخ و علمائے اہل حدیث ، علمائے دیوبند اور فرنگی محل شامل ہیں ۔

ان لوگوں میں مولانا آزاد سبحانی ، مولانا راغب احسن، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شائق احمد عثمانی پیش پیش تھے[۲۹] ۔

مولانا حسرت موہانی، عبدالماجد بدایونی ، داؤد غزنوی ، مولانا راغب احسن اور ابوالہاشم ، مولانا آزاد سبحانی سے متاثر ہو کر بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر جمعیت العلمائے اسلام کی حمایت کرتے رہے ۔ جمعیت علمائے اسلام سے تعلق رکھنے والے ممتاز علمائے کرام میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :

مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا مفتی محمد شفیع ، ظفر احمد انصاری ، احتشام الحق تھانوی ، سید محمد سلیمان ندوی ، جمال میاں

فرنگی محلی ، مولانا احمد علی لاہوری ، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا غلام غوث ہزاروی ، مولانا مفتی محمود ۔

کانگرس سے تعاون اور علیحدگی

خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے زمانے میں ہندو اور مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں دوسرے مسلمان زعماء کی طرح مولانا آزاد سبحانی بھی کانگرس کے قریب ہوگئے تھے، لیکن شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کے سبب سے مولانا کانگرس سے بیزار ہو گئے ۔ مولانا ۱۹۲۳ء میں یو پی کانگرس کمیٹی کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے "ڈانڈی مارچ" کی تائید میں انھوں نے بھی گرفتاری پیش کی تھی، لیکن بعدازاں جب انھیں کانگرسی لیڈروں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو وہ سمجھ گئے کہ کانگرس صرف ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرنے کا عہد کرچکی ہے اور مسلمانوں سے اتحاد اس کی عیاری پر مبنی ہے اور اسے مسلمانوں کی آزادی یا مدد سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ۔ لہٰذا مولانا کانگرس سے بدظن ہو گئےاور اس سے لاتعلقی اختیار کرکے وہ مسلم لیگ کے قریب ہوئے اور تحریک قیام پاکستان تک آپ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص پر زور دیتے رہے :

"کانگرس۔ ۔ ۔ کی تجویز پر مولانا آزاد سبحانی اور حسرت موہانی وغیرہ پہلے ہی بد دل تھے۔ ان کا گاندھی جی کی قیادت پر بھی اعتماد نہ تھا ۔ آزاد سبحانی پر گاندھی جی کے فیصلہ (ترک موالات کی تعطلی کا فیصلہ) کا بہت خراب اثر پڑا ، بعدازاں

آہستہ آہستہ وہ کانگرس کی عملی سیاست سے دور ہوتے گئے اور تمام عمر وہ گاندھی جی سے کوئی سیاسی مفاہمت نہ کر سکے"[۳۰]۔

" ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ نمک کا ٹیکس نہیں دیں گے اور خود نمک بنائیں گے ۔ اس تحریک میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد سبحانی دوسرے مسلمان لیڈروں اور عام مسلمانوں کی طرح اپنے ہم وطنوں (یعنی ہندوؤں) سے پیچھے نہ رہے اور ان گنت مسلمان لیڈر ، عام کارکن اور شہری ہزاروں کی تعداد میں گرفتار ہوئے[۳۱] ، لیکن ہندوؤں نے اس تحریک میں بھی اپنی مفاد پرستی کا ثبوت دیا اور مسلمانوں کو حسب معمول دھوکا دیا ۔ مولانا آزاد سبحانی نے ہندوؤں کی عیاری اور مفاد پرستی اور مسلم دشمنی کا گہرا مطالعہ کیا اور کانگرس سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لیے ۔ بعدازاں مسلمانوں کی جدا گانہ تنظیم کے لیے تحریک دعوت اور خلافت ربانی کا فلسفہ اور تصور پیش کیا اور عمر بھر اپنی تمام تر مساعی مسلمانوں اور بالخصوص مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے وقف کر دیں"[۳۲]۔

ترک موالات اور مولانا آزاد سبحانی

تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ عدم تعاون کی تحریک چل نکلی تھی اور برصغیر کے کئی رہنماؤں نے سودیشی کپڑا پہننا لازم قرار دے لیا تھا ۔ مولانا حسرت موہانی نے تو "سودیشی سٹور" کے نام سے دکان کھول لی تھی ۔ اسی دور میں مولانا آزاد سبحانی کھدر پہننے

لگے تھے اور اس کی دوسروں کو تلقین کیا کرتے تھے ۔ ان کا لباس گاڑھے کا کرتا ، اسی کا تہہ بند ، اسی کی چادر اور لکڑی کی کھڑاؤں ہو گیا تھا[۳۳]۔

۱۹۲۱ء کے اواخر ہی میں علماء کے ایک بڑے طبقہ کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ تحریک ترک موالات اور سول نافرمانی سے انگریزوں کو ملک سے نکالنا ناممکن ہے ۔ مولانا آزاد سبحانی اور ان کے ہمدم و رفیق مولانا حسرت موہانی کا یہ خیال تھا کہ برطانوی حکومت سے قطع تعلق کر لیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو ان کے اخراج کے لیے طاقت بھی استعمال کی جائے ۔ آزاد اور حسرت کے انقلابی خیالات کو کانگرسی رہنماؤں نے احمد آباد کے اجلاس میں نظرانداز کر دیا ۔ حسرت موہانی اس ناکامی سے بد دل نہ ہوئے اور اس تجویز کو خلافت کانفرنس کے جلسہ میں لائے ، لیکن یہاں پر حکیم اجمل صاحب نے اس کی اجازت نہ دی[۳۴]. . . مولانا آزاد سبحانی خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے دور میں مسلم لیگ کے اجلاسوں میں بھی شریک ہونے لگے تھے[۳۵]۔

جناب حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں :

"میں نے ان کو ایک جلسہ عام میں دیکھا جو غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں چمن گنج کانپور کے ایک میدان میں ہوا تھا اور ان کی پر جوش تقریر کے بعد حاضرین جلسہ نے اپنے تمام بدیسی کپڑے اور ترکی ٹوپیاں جمع کرکے نذر آتش کر دی تھیں[۳۶] " ۔

نیز جناب خواجہ جمال احمد لکھتے ہیں :

”غالباً ۱۹۲۰ء کی بات ہے خلافت اور کانگرس کی قرار دادوں کے تحت حکومت برطانیہ سے عدم اشتراک کی تحریک ہندوستان میں شباب پر تھی - سرکاری ملازمین دھڑا دھڑ اپنی ملازمتوں سے استعفے دے رہے تھے - زندگی کی آسائشوں اور مستقبل کی تابناکیوں کی پروا کیے بغیر وہ قوم اور ملک کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ہندو مسلمانوں میں ایسا جذبہ شاذ و نادر ہی کبھی دیکھنے میں آیا تھا - اس تحریک میں انگریزی سکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا - چنانچہ علی برادران ، مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد سبحانی اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بند کرانے کے لیے وہاں پہنچ گئے - وہاں تین دن تک اس کے متعلق بحث و مباحثہ اور تقریریں ہوتی رہیں - یونیورسٹی کے خیر خواہ اساتذہ اور طلبا دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے - زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو یونیورسٹی کو بند کر دینے کے مخالف تھے - مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، ڈاکٹر انصاری اور مولانا حسرت موہانی نے اڑی دھواں دھار اور جوشیلی تقریریں کیں اور یونیورسٹی میں مروج انگریزی طرز تعلیم کو ہندوستانی نوجوانوں کے لیے ضرر رساں اور مہلک قرار دیا - لیکن طلبا اور اساتذہ پر اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا اور وہ یونیورسٹی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے - تیسرے دن مولانا آزاد سبحانی اسٹیج پر نمودار ہوئے - انھوں نے اتنی درد انگیز اور

مدلل تقریر کی، جس کو سن کر سامعین کے آنسو جاری ہوگئے۔
بہت سے طلبا اور اساتذہ جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان
(جو بعد میں ڈاکٹر ہوئے) بھی شامل تھے یونیورسٹی سے
باہر نکل آئے اور اس طرح علی گڑھ میں قومی درسگاہ جامعہ ملیہ
کی بنیاد پڑی"[۳۷]۔

تحریک خلافت میں ان کا حصہ

۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری کے جاری کردہ فتاوی متعلق
بہ جزیرۃ العرب پر دستخط کیے تھے۔ انھوں نے تحریک خلافت
میں فعال کردار ادا کیا۔ مختلف اجلاسوں میں شریک ہوئے۔
فروری ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس بمبئی کے اجلاس
(شعبۂ علماء) کی صدارت کی اور اسی سال ستمبر میں آل انڈیا خلافت
کانگرس کلکتہ کی صدارت کی۔ وہ یو پی خلافت کمیٹی کے عہدۂ
صدارت پر بھی فائز رہے اور ضلعی سطح کی کئی ایک کانفرنسیں
منعقد کرکے مسئلۂ خلافت کی اہمیت اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح
کیا[۳۸]۔

جنگ عظیم (اول) کے آغاز ہی سے مسلمانان ہند مسئلۂ ترکی پر
کافی پریشان تھے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کی سالمیت اور مسئلۂ
خلافت نے ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کو ایک سخت
اور دشوار صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ علمائے کرام ترکی اور
خصوصاً خلافت کے مسئلہ پر بے حد مضطرب تھے۔ دریں اثنا بمبئی
میں مسلمانوں نے مجلس خلافت کمیٹی قائم کی۔ سیکرٹری سید
رشید الدین صاحب مودودی مقرر ہوئے اور صدارت کے عہدہ پر

ممتاز حسین صاحب فائز ہوئے[۳۹] . . . آزاد سبحانی بہر نوع خلافت کمیٹی سے وابستہ رہے ۔ آپ کانپور خلافت کمیٹی کے سرگرم رکن تھے ۔ ۱۹۲۰ء میں یو پی خلافت کمیٹی کے صدر ہوئے ۔ اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت کے فرائض انجام دیے[۴۰] ۔

مولانا آزاد سبحانی کی فعال طبیعت صرف خلافت کمیٹی کی تاسیس یا جمعیۃ العلماء کے قیام سے مطمئن نہ رہ سکی ۔ وہ مسلمانوں کو اسلامی شعار سے واقف اور اس پر عمل کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے ۔ ترک موالات اور خلافت تحریکات نے مسلمانوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے تھے اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو دینی شعور سے آگاہ کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سلیمان پھلواروی کی شرعی عدالتوں کے قیام کی تحریک میں برابر کے شریک رہے[۴۱] ۔

مولانا آزاد سبحانی اور موپلا مسلمان

تحریک خلافت اور عدم تعاون میں مالا بار کے موپلا مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ اس سیاسی بیداری کو کچلنے کے لیے مقامی انتظامیہ نے سختی سے کام لیا ۔ موپلا مسلمان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ اس صورت حال سے مشتعل ہو کر موپلوں نے نہ صرف سرکاری عمارات اور جائداد کو نقصان پہنچایا بلکہ حکومت کے حامیوں کی جان و مال بھی ان کے غصہ کی زد میں آ گئے ۔ حکومت نے اسے فرقہ وارانہ فساد کا نام دے کر مارشل لا نافذ کر دیا ۔ مزید سینکڑوں افراد گرفتار کر لیے گئے ۔ گرمیوں کے موسم میں

14-5-91

ایک سو افراد کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بند کرکے لے جایا جا رہا تھا کہ دم گھٹنے سے ان میں سے ستر ہلاک ہو گئے ۔ بہت سے افراد کو سزائے موت دے دی گئی اور باقی لوگوں کو قید و بند کی سزائیں سنائی گئیں ۔

موپلا مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے مولانا آزاد سبحانی تڑپ اٹھے ۔ مسلم لیگ کے اجلاس (دسمبر ۱۹۲۱ء ۔ الہ آباد) میں موپلا مسلمانوں کے بارے میں حکومت کے رویے پر بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا اور قرارداد میں ایک کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا، جسے مالا بار جا کر رپورٹ تیار کرنا تھی ۔ اس قرارداد کی تائید کرنے والوں میں مولانا آزاد سبحانی شامل تھے ۔ اس کے چند ماہ بعد ۳ تا ۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو جمعیۃ العلماء ہند کا خصوصی اجلاس اجمیر میں ہوا اور اس اجلاس میں بھی موپلا مسئلہ پر رپورٹ تیار کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی ۔ یہ کمیٹی مولانا آزاد سبحانی کی نگرانی میں بنی تھی اور اس نے اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی ۔ موپلا مسلمانوں کی امداد و تعاون کے لیے انھوں نے موپلا ریلیف فنڈ قائم کیا اور موپلاؤں کی مدد کے لیے اپنی سی کوشش کی[۴۲]۔

مولانا عبیداللہ سندھی اور آزاد سبحانی

مولانا آزاد سبحانی جس قدر بہتر مقرر یا خطیب تھے اس سے زائد دلچسپ اور دلپذیر گفتگو کے ماہر بھی ، چنانچہ بار ہا دیکھا گیا کہ علماء اور فضلاء کی بڑی سے بڑی محفل میں تمام لوگ اسی کے خواہش مند رہتے کہ بس مولانا بولتے رہیں اور وہ خاموشی سے سنتے

رہیں ، لیکن اپنی خداداد صلاحیت کے باوجود وہ ایک سچے طالب علم بھی تھے۔ چنانچہ جب مولانا عبیداللہ سندھی نے جامعہ ملیہ دہلی میں قیام کیا اور اپنا دارالحکمت قائم کیا، تو مولانا آزاد سبحانی بار بار وہاں جا کر مولانا سندھی کے درس تفسیر قرآن میں کئی کئی روز شریک ہوتے اور نہایت خاموشی سے استفادہ کرتے دیکھے گئے ۔ یہ تھا وہ "فیلسوف ہندی" جو مباحثہ اور مناظرہ کے لیے ایک طرف تو عالم اسلام میں اپنا چیلنج لیے پھرا مگر جب اسے کسی دوسرے کے تفکر بالقرآن سے استفادہ کا موقع ملا تو وہ صرف ایک طالب علم بننے پر تیار نظر آیا[۴۳] ۔

حسرت موہانی اور آزاد سبحانی

مولانا حسرت موہانی ان کے قریبی ہمنوا اور رفیق تھے[۴۴] ۔ مولانا آزاد سبحانی اپنی نوعیت کے یکہ و تنہا فرد تھے ۔ مولانا حسرت موہانی اور وہ باہم بے حد گہرے دوست تھے اور ان کا شمار عجائبات روزگار میں ہوتا تھا اور وہ اس شعر کے مصداق تھے :

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[۴۵]

آزاد سبحانی کے رفقاء

مولانا خلیل الدین آزاد صمدانی (المتوفی ۱۹۷۲ء) سے ان کے گہرے مراسم تھے[۴۶] ۔ مولانا آزاد سبحانی کے مداحین اور معتقدین کی بڑی تعداد ہند و پاک میں موجود ہے . . . پاکستان میں سرکردہ افراد میں مولانا راغب احسن اور جناب ابوالہاشم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ان کے

مداحوں کی کثیر تعداد پاکستان منتقل ہو گئی ۔ انھوں نے مولانا کو پاکستان کی شہریت اختیار کرنے کے تقاضے کیے، لیکن مولانا اس کے لیے کبھی تیار نہ ہو سکے اور بالآخر ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھا ۔ یہیں رہے اور یہیں سپرد خاک ہوئے ۔ اس فیصلہ کے لیے بھی مولانا کو بڑی قیمت چکانی پڑی :

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا[۳۷]

ریشمی خطوط کی تحریک اور آزاد سبحانی

انڈیا آفس لندن میں محفوظ کیے گئے ریشمی خطوط کی ڈائرکٹری میں مولانا آزاد سبحانی کا تذکرہ یوں ملتا ہے :

"عبدالقادر آزاد سبحانی آف مدرسہ' الٰہیات کانپور ایک فتنہ پرداز مولوی ہے ، جس کے پیرووں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ کانپور مسجد کے فساد کا روح رواں تھا ۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے"[۳۸] ۔

حواشی باب دوم

۱ ۔ تحقیقات : ۱۰۱

۲ ۔ شب چراغ : ۱۱۷

۳ ۔ چند یادیں : ۱۱۰

۴ ۔ تعلیقات : ۱۰۴ ، Tara Chand, *History of Freedom Movement in India*' Vol : 3, p. 411

۵ ۔ ایضاً اور رسالہ حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق ، تالیف : عنایت اللہ

۶ - ایضاً اور ایضاً ، ص ۱۷-۱۶

۷ - تحقیقات : ۱۰۳ ، Separatism Among Indian Muslims, p. 15-214

۸ - مسودات ڈاکٹر این اے بلوچ

۹ - تحقیقات : ۱۰۵ اور Home Department - Poll - (B) No. 70-74, Nov. 1913

۱۰ - ایضاً : ۱۰۷ اور ایضاً

۱۱ - چند یادیں : ۱۱۲ - ۱۱۳

۱۲ - العلم : ۱۲ ، حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۔ ۱۹۴۳ء ، ص ۶۰۱ - ۶۰۲ ، دید و شنید ، از رئیس احمد جعفری ، لاہور- ۱۹۴۸ء ، ص ۵۸ - ۶۰ ، اعمال نامہ از سر رضا علی ، دہلی ۔ ۱۹۴۹ء ، ص ۳۱۰ ، داستان پاکستان از چودھری نذیر احمد خان ، لاہور - ۱۹۴۷ء ، ص ۱۳ ، اوراق گم گشتہ از رئیس احمد جعفری ، کراچی ، ۱۹۷۰ء ، ص ۱۴ ، مجلہ برگ گل ، اردو کالج ، قائداعظم نمبر ، کراچی - ۱۹۷۲ء ، ص ۱۴۸ - ۱۵۰

۱۳ - اعمال نامہ ، حادثہ مچھلی بازار کانپور ، علی برادران : تالیف ، سید رئیس احمد جعفری ، محمد علی اکیڈمی لاہور - ۱۹۶۳ء ، ص ۳۲۸- ۳۱۲

۱۴ - العلم : ۱۲

۱۵ - ایضاً ، ص ۱۲-۱۳

۱۶ - تحقیقات : ۱۱۲

۱۷ - العلم : ۱۶ ، نامہ اعمال ، جلد اول از سر محمد یامین ، لاہور- ۱۹۷۰ء ، ص ۳۰۳

۱۸ - ایضاً ، روز نامہ ندائے ملت ، لاہور - جنوری ۱۹۷۰ء

۱۹ - تحقیقات : ۱۱۲ - ۱۱۳

۲۰ - جمیلہ خاتون ، انٹرویو ڈاکٹر این اے بلوچ

۲۱ - تحقیقات : ۱۱۳
۲۲ - ایضاً : ۱۱٦
۲۳ - شریف الدین پیرزادہ ، فاؤنڈیشن آف پاکستان (کراچی : نیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹٦۹ء) جلد اول ، ص ۵۵۷- ۵۵۴
۲۴ - تحقیقات : ۱۰۹
۲۵ - ایضاً
۲٦ - ایضاً
۲۷ - العلم : ۴، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی از منشی عبدالرحمٰن خان ، لاہور، ۱۹۵٦ء ، ص۱۳ ، نوائے وقت، لاہور - ۲۸ فروری ۱۹۸۰ء
۲۸ - تحقیقات : ۱۱٦
۲۹ - ۱ - حافظ محمد اللہ ، مجلس دعوت الحق ، کراچی ، سال طباعت درج نہیں ، ص ۳۵
۲ - محمد انوار الحسن شیرکوٹی ، انوار عثمانی ، کراچی - ۱۹٦٦ء ، ص ۵۳- ۵٦
۳ - اشتیاق حسین قریشی ، علماء ان پالیٹکس ، کراچی - ۱۹۷۲ء ، ص ۳۵۷
۴ - محمد میاں ، مولانا ظفر احمد صاحب کے فتویٰ پر تبصرہ ، دہلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۱
۵ - پی - ہارڈی ، برطانوی انڈیا کے مسلمان ، کیمبرج ، ۱۹۷۹ء ، ص ۲۴۲
۳۰ - تحقیقات ۱۱۱ - ۱۱۲
۳۱ - العلم : ۱۳، مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری، بدایوں - ۱۹۴۰ء ، ص۳۸۹-۳۹۰ ، سیاست ملیہ از محمد امین زبیری، مطبوعہ آگرہ - ۱۹۴۱ء ، ص ۱۳۷ - ۱۳۸ ، شاہراہ پاکستان از چوہدری خلیق الزماں ، کراچی - ۱۹٦۷ء ، ص ۳۲۸
۳۲ - العلم : ۳ ، شاہراہ پاکستان ، ص ۳۳۱ - ۳۳۲
۳۳ - فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول

۳۴ - تحقیقات: ۱۱۰ ، Separatism Among Indian Muslims, p. 322

۳۵ - ایضاً : ۱۱۲

۳۶ - شب چراغ : ۱۱۷

۳۷ - چند یادیں : ۱۱۳ - ۱۱۴

۳۸ - مسودات ڈاکٹر این اے بلوچ

۳۹ - تحقیقات : ۱۰۹ ، رسالہ حسرۃ الآفاق ، ص ۲۳-۲۵

۴۰ - تحقیقات : ۱۰۹ ، Separatism Among Indian Muslims, pp. 306, 426-27

۴۱ - ایضاً : ۱۱۰ ، Separatism Among Indian Muslims, pp. 329, 426-27

۴۲ - فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول ، ص ۵۶۳-۵۶۵ ، پروین روزینہ ، جمعیۃ العلماء ہند (اسلام آباد : قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت ، ۱۹۸۰ء) جلد اول ، ص ۱۲۵ ، ۳۲۳ ، ۳۶۶

۴۳ - شب چراغ : ۱۲۱-۱۲۲

۴۴ - تحقیقات : ۱۱۸

۴۵ - شب چراغ : ۱۲۱

۴۶ - العلم : ۱۱ ، تاریخ ہند و پاک ، از مولانا قاری احمد پیلی بھیتی ، کراچی - ۱۹۷۴ء ، ص ۳۷۰

۴۷ - تحقیقات : ۱۱۸

۴۸ - تحریک شیخ الہند (انڈیا آفس لندن میں محفوظ ریکارڈ کا اردو ترجمہ) مرتبہ سید محمد میاں ، مکتبہ محمودیہ لاہور ، استقلال پریس لاہور - ۱۹۷۸ء ، ۳۸۶ ص

باب سوم

تحریک ربانی ۔ خلافت ربانی

مولانا آزاد سبحانی نے ۳۱-۱۹۳۰ء میں گورکھپور میں تحریک ربانی شروع کی ، جس کا مقصد مختلف پیشہ ور مسلمانوں کو ان کے پیشہ کے مطابق متحد کرنا اور ان میں اسلامی روح کو بیدار کرنا تھا ۔ وہ مسلمانوں کو مذہبی اور معاشی اصلاحات کے ذریعے باعمل بنانے اور ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو استوار کرنا چاہتے تھے ۔ انھوں نے مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے اور کھدر پہننے کی تلقین کی ۔ انھوں نے مسلمان کاریگروں کو ان کے پیشے کے مطابق منظم کیا اور ان کی گلڈ (جماعت) بنائی۔ سب سے پہلے انھوں نے کپڑے کے کاریگروں کی گلڈ بنائی ۔ بعدازاں صرف کاریگروں کی باری آئی ۔ مولانا کی یہ تحریک یو پی کے مشرقی اضلاع اور خصوصاً گورکھپور میں بہت مقبول ہوئی ۔

تحریک ربانی کی تحریک کے تحت مولانا اسلام کے اصولوں کو مسلمانوں کی ذاتی زندگی میں برتنا چاہتے تھے ، تا کہ صحیح اسلامی معاشرہ ظہور پذیر ہو ۔ اس تحریک کے تحت دس بارہ اصول پیش کیے گئے۔ گھر گھر جا کر دیکھنا کہ کوئی بھوکا نہ رہے ۔ اصراف بیجا

اور خصوصاً سگریٹ نوشی سے پرہیز کرنا ۔ محلوں میں ہفتہ وار
اجتماع کرنا اور اس میں معاشرتی معاملات پر تبادلہ خیال کرنا ۔
وغیرہ وغیرہ ۔

انھوں نے "جمعیت ربانیہ" کے نام سے ایک تصور پیش کیا ۔ وہ
اس کے لیے حصول پاکستان کو لازمی قرار دیتے تھے اور اپنے رسالہ
"دعوت" میں مسلمانوں کے الگ وطن کے لیے "اسلامستان در ہندستان"
کے زیر عنوان مستقلاً لکھتے رہے تھے ۔

مولانا آزاد سبحانی اپنے مقصد اور کام میں بڑا انہماک رکھتے
تھے ۔ جس دور میں وہ "جمعیت ربانیہ" کا تصور عام کر رہے تھے ،
بچوں کو اپنے گرد جمع کر لینے اور سب کو تلقین کرتے کہ وہ سلام
کے جواب میں "وعلیکم السلام" کے ساتھ مزید کہا کریں "اللہ حاکم
ہم کارندے" یہ خلیفۃ اللہ ہونے کا مفہوم تھا ۔ جس کا تذکرہ وہ
اپنی تحریک کے سلسلہ میں بڑی اہمیت سے کرتے تھے ۔

"ربانی بنو" ان کی تحریک کا ماٹو تھا ۔ اپنے عقیدت مندوں ،
عزیزوں اور شاگردوں سے بہ اصرار کہتے تھے کہ وہ اپنے نام کے
ساتھ "ربانی" اور "ربانیہ" کے الفاظ لکھا کریں، تا کہ "کونوا ربانیین"
کے لیے راستہ ہموار ہو سکے اور پھر فکر و عمل کی وہ منزل آ جائے
کہ یہ "جمعیت ربانیہ" "ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ" کا
پیکر بن جائے ۔

مولانا نے اپنی زندگی کا مقصد ، بقول میاں ظفیر احمد
"حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" کے قیام کو بنا لیا تھا ۔

"ان کی ساری تقریر و تحریر بس اسی نقطہ کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ تقریر چاہے کسی عام اجتماع اور پبلک پلیٹ فارم سے ہو یا نجی صحبت اور نشست میں، ان کے درس اور لکچر کا ہمیشہ یہی عنوان ہوا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک مسلمان اگر عبادت نہیں کرتا ہے تو وہ فاسق ہے لیکن مسلمان باقی رہتا ہے، لیکن اگر مسلمان کے پاس خلافت نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے . . . مسلمان خلافت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر سورج کی روشنی ختم ہوگئی تو سورج نہیں رہ سکتا، اس لیے اگر خلافت نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے عبادت نہیں ہے تو فاسق ہے لیکن مسلمان ہے، لیکن خلافت کے جانے سے مسلمانیت کا خاتمہ ہے۔ مسلمانوں کی اصل ماہیت اور حقیقت خلافت ہے۔ مولانا آزاد سبحانی نے تحریک ربانی کی ابتدا کے ساتھ ہی دو مختلف جریدے "ربانیت" اور "دعوت" اپنے فرزند حسن سبحانی صاحب کی نگرانی اور اہتمام میں لکھنؤ سے جاری کیے۔ مولانا نے تعلیمی اور دینی تبلیغ کے فروغ کے لیے غالباً سب سے پہلے ہندوستان میں مراسلاتی یونیورسٹی کا تصور پیش کیا اور عملاً اسے کر دکھایا۔

نیز میاں ظفیر احمد لکھتے ہیں:

"ہماری ذہنی بیداری میں سب سے زیادہ حصہ ان علماء کرام اور مفکرین قوم کا ہے جنھوں نے اپنی زبان سے نیزہ کی انّی کا کام لیا اور قلم کو شمشیر آبدار بنائے رکھا۔ شاہ ولی اللہ، سرسید، محمد علی جوہر، حالی، اکبر، مولانا ابوالکلام آزاد،

اقبال ، ظفر علی خان ، مولانا سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلی مودودی الهی ناموران قوم میں سے ہیں ۔ ان بزرگوں کی تحریروں اور تقریروں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو شجاعت کا درس دیا ۔ مولانا آزاد سبحانی بھی اپنے فکر و فلسفہ اور داعی "تحریک حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" کی حیثیت سے ان ہی جیسے اکابرین قوم میں شامل تھے ۔ پاکستان کے تناظر میں ان میں سے بعض اکابر قوم کے سیاسی افکار سے اختلاف (اور یہ اختلاف صحیح ہے) تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی ایک خوبی اور خدمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان بزرگوں کی تقریروں اور تحریروں نے برصغیر جنوبی ایشیا کے درماندہ اور شکستہ حال مسلمانوں کے قلوب کو حریت فکر اور جذبۂ جہاد سے گرمایا، جو آگے چل کر تحریک پاکستان کے محرکات اور قیام پاکستان کی صورت میں نمودار ہوئیں" ۔

مولانا آزاد سبحانی درحقیقت داعی "حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" تھے اور وہ قرآن کی تفسیر اور رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی تشریح اس انقلابی نظام کو برپا کرنے کے لیے بڑے ہی فلسفیانہ اور منطقی دلائل کے ساتھ کیا کرتے تھے ۔ مولانا آزاد سبحانی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا سب سے بڑا انقلابی سمجھتے تھے . . . مولانا آزاد سبحانی کی زندگی کا مشن اور مقصد حیات "حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" کا قیام تھا ۔

مولانا "تفسیر ربانی" کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے جو غالباً مکمل نہ کر سکے ۔ البتہ "مقدمہ علم القرآن"

کے نام سے اس تفسیر کا مقدمہ ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا تھا ۔ اس میں انھوں نے بڑے ہی فلسفیانہ مباحث جمع کیے ہیں ، جن کا اندازہ ان میں درج عنوانات سے کیا جا سکتا ہے ۔ ان مباحث کے عنوانات بہت طویل ہیں چند کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے ۔ مثلاً "حقیقت القرآن" ، "موقف القرآن" ، "منشاء القرآن" اور قرآن کے سیاسی نظریات مثلاً نظریۂ وحدانیت ، نظریۂ حقانیت ، نظریۂ ارتقائیت ، نظریۂ اکمالیت (تکملیت) ، نظریۂ ربانیت ، نظریۂ عرفانیت، نظریۂ ایمانیت، نظریۂ وارثیت وغیرہ . . . . فلسفۂ ربوبیت پر ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "زبور ربانی" کے نام سے شائع ہوا تھا ۔

جب مولانا آزاد سبحانی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی جگہ امامت و خطابت کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں بھی واضح فرق یہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبوں کا عنوان "اقیم الصلوٰۃ و اتوالزکوٰۃ" ہوا کرتا تھا ۔ مولانا آزاد سبحانی کے خطبوں کا موضوع "حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" ہوا کرتا تھا ۔ مولانا آزاد سبحانی عیدین کے علاوہ جب بھی تقریر کرتے تھے ان کی تقریر اور تحریر کا بس یہی موضوع ہوا کرتا تھا ۔

فلسفۂ خلافت ربانی سے متاثر ہونے والی بعض نامور شخصیات

مولانا راغب احسن، آزاد سبحانی کی تحریک "احیاے حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" کے نہ صرف مداح تھے بلکہ انھوں نے اپنی بے پناہ قوت تحریر سے اس فلسفہ کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لیے اڑا

کام بھی کیا ۔ بنگال کی دوسری اہم مسلم لیگی شخصیت ابو الہاشم کی تھی ۔ وہ اشتراکیت اور ترقی پسندی کے زمرے سے جب باہر نکلے تو ان پر مولانا آزاد سبحانی کا اثر غالب تھا ۔ بلکہ ان کی صحبت نے ابوالہاشم کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اور وہ اشتراکی تصورات کی جگہ اسلامی انقلاب کی تبلیغ کرنے لگے تھے ۔ ابوالہاشم کو جن لوگوں نے آخری زمانہ میں دیکھا وہ اس بات کی تصدیق کرسکیں گے کہ انھوں نے نہ صرف مولانا آزاد سبحانی کے فکرو فلسفہ کو اپنا لیا تھا بلکہ اپنا رہن سہن اور لباس بھی مولانا ہی جیسا اختیار کر لیا تھا ۔ گیروئے رنگ کی دھوتی ، کرتا اور پاؤں میں چپل ۔ کراچی میں مجھے ایک اور صاحب انیس الرحمٰن ایڈووکیٹ ملے ہیں ، جن کو میں مولانا آزاد سبحانی کی تعلیمات سے بہت متاثر دیکھتا ہوں ۔

بنگلا دیش (مشرقی پاکستان) میں جن لوگوں نے خلافت ربانی پارٹی قائم کی تھی ان میں اکثر و بیشتر وہی لوگ شامل تھے جو مولانا آزاد سبحانی کے فلسفے "حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" سے متاثر تھے ۔ افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد ہم اسلامی فکر و فلسفہ کے مبلغ ، دیو قامت شخصیتوں کی پذیرائی اور قدر افزائی نہ کر سکے اور ہم نے ان لوگوں کو سروں پر اٹھا رکھا ہے ، جو ادھر ادھر سے جوڑ جمع کرکے چند مستعار اور مانگے تانگے کے خیالات کو جیسے تیسے قلم بند کر کے پیش کرتے ہیں ۔ ہم انھیں دانشور ، مفکر ، اہل قلم جیسے بھاری بھر کم نام دے کر خوش ہوتے ہیں کہ بڑا تیر مارا اور یہ بھولتے ہیں کہ تاریخ کا عمل

بڑا سخت گیر اور بے رحم ہوا کرتا ہے - جب مؤرخ ہمارے زمانے کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو اہل علم اور اہل فکر کی طرف سے ہماری بے حسی کو کس انداز میں پیش کرے گا - کبھی یہ بھی سوچا ہوتا

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا[۲]

حواشی باب سوم

۱ - چند یادیں : ۱۱۶

۲ - آزاد سبحانی ، حکومت الٰہی اور خلافت ربانی ، تحریر : میاں ظفیر احمد ، مطبوعہ روزنامہ جنگ ، کراچی

باب چہارم

مولانا آزاد سبحانی بحیثیت فلسفی

آزاد سبحانی ایک متبحر عالم اور فلسفی تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی ۔ گیروئے رنگ کی دھوتی ، کرتا اور چپل ان کا لباس تھا لیکن آدمی بہت ہی دبنگ تھے۔ جو لوگ ان کے درس میں شامل رہے ہیں ، وہی ان کے مدلل فلسفیانہ اسلامی مباحث کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ درس کے سلسلے میں یہ ہدایت تھی کہ "مجلس آرائی" کی جائے۔ یہ الفاظ مولانا ہی کے ہیں ۔ نشست اس طرح رکھی جائے کہ اہل علم دانشور ان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں اور طلبہ مبتدی اور عام آدمی پیچھے اور جب وہ بولتے تو علم و حکمت کے موتی پروتے جاتے ۔ جو جتنا پڑھا لکھا ہوتا اتنا ہی زیادہ ان فلسفیانہ مباحث سے لطف اٹھاتا ۔ بہار اور بنگال میں مجھے ایسی کئی بہت ہی پڑھی لکھی ، علمی اور سیاسی شخصیتوں کو دیکھنے اور سننے کے مواقع حاصل ہوئے ، جو آزاد سبحانی کے فلسفہ سے بہت متاثر تھے ۔ ان میں دو نام ایسے ہیں جن سے پاکستان کے لوگ بھی اچھی طرح واقف ہیں[1]۔

مولانا آزاد سبحانی پر منطق و فلسفہ کا بہت گہرا اثر تھا ۔ وہ اسلام اور قرآنی تعلیمات کی فلسفیانہ انداز میں منطقی استدلال کے ساتھ

توجیہات کرتے تھے - اس میدان میں وہ اپنے دور کے منفرد عالم دین تھے[۲]-

حکیم نثار احمد علوی صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے مولانا (آزاد سبحانی) سے دریافت کیا کہ الصلٰوۃ معراج المومنین کے کیا معنی ہیں ، مولانا سن کر مسکرائے اورکچھ دیر توقف کے بعد یوں گویا ہوئے :

"حدیث شریف میں ہے لا صلٰوۃ الا بحضور القلب ، یعنی نماز بلا حضور قلب کے ادا نہیں ہوتی - حضور قلب سے حقیقت قلبیہ میں الوہیت و عبودیت کا جمع ہونا مراد ہے ، مثلاً بندہ نماز میں الحمد پڑھتا ہے اور وہ کلام الٰہی ہے، حالانکہ نماز میں صاحب کلام بندہ ہوتا ہے نہ کہ حق - اور ایاک نعبد میں روے خطاب بندہ کا حق کی جانب ہوتا ہےنہ کہ حق کا بندے کی طرف اور باوجود اس کےوہ کلام الٰہی ہے، پس اس کا کلام حق کا کلام ہے اور حق کا کلام اس کا کلام ہے اور اسی طرح سے معبود جو عبد کے ذہن میں متصور ہوتا ہے، من جملہ تصورات عبد کے ایک جزو ہوتا ہے، جن کا خالق عبد ہے اور عبد خود بحیثیت ظہور کے ایک حقیقت ممکنہ ہے ، جو اعیان ثابتہ علمیہ حق کا ایک جزو ہے ، جس کا خالق حق ہے اور ہر حرکت اور ہر سکون اس کا بہ اردۂ الٰہی ہے - لٰہذا عبد عین معبود ہے اور معبود عین عبد - اس محل حیرت میں ایک عجیب راز پوشیدہ ہے ، جو اپنی شدت اجمال کی وجہ سے بے مقام ہوکر لا مکانی میں بسیط ہو گیا ہے اور اتنے اشارے سے زیادہ بیان

میں نہیں آسکتا اور اس کا حصول الجھن اور جوش قلب و نامرادی پر موقوف ہے۔ جس قدر یہ باتیں زیادہ ہوں گی اسی قدر سالک اس میں در آئے گا اور سرور زیادہ ہوگا۔ جیسے برف کے کارخانے میں جب تک انجن خوب گرم و شعلہ انگیز نہ ہو برف کی تیاری ناممکن ہے اور یہی نماز بے خطرہ کہلاتی ہے۔ کیونکہ خطرات جس قدر ہوتے ہیں وہ سب جوش قلب اور نامرادی میں فنا ہو جاتے ہیں اور وجود سرور محض رہ جاتا ہے۔ یہی معنی حدیث الصلٰوۃ معراج المومنین کے ہیں۔ یعنی نماز وہی ہے جس میں مومن کو معراج ہو"۔

یہ چند فرمودات سبحانی محض تعارف کے لیے میں نے نقل کر دیے ہیں، ورنہ مولانا آزاد سبحانی کی گفتگو فلسفیانہ نکات کا بحر زخّار تھی اور مبتدی قسم کے تعلیم یافتہ آدمی کی سمجھ سے باہر تھی۔ مولانا اپنی نوعیت کی ایک بے مثال شخصیت تھے۔ ان کا ظاہری سراپا مکمل پوشش کا حامل نہیں تھا۔ وہ اکثر احرام پوش رہتے تھے۔ ایک چادر باندھ لی اور ایک اوڑھ لی۔ سر ہمیشہ ننگا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں یا معمولی چپل۔ ایک بدہیئت سا تھیلا ہاتھ میں، جس میں کچھ اخبار، کچھ رسالے، کچھ کتابیں اور ٹوٹی ہوئی پنسلیں اور بس۔ ان کے علم کا یہ حال کہ جدید تمام نظریات سیاست و سماج سے مکمل واقف۔ وہ "الفیلسوف الہندی" ہونے کے اس دعوی کے ساتھ مدعی تھے کہ دنیا کا کوئی فلسفی اور کسی مذہبی منطق کا کوئی بھی عالم کسی موضوع پر ان سے مقابلہ کرے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ اپنے اس دعوے کے ساتھ ممالک عرب، یورپ اور امریکہ

تک کچھ عجب شان فقیرانہ سے چکر لگا آئے اور چونکہ عربی اور فارسی کے منتہی اور انگریزی میں جو انھوں نے جیلوں میں رہ کر پڑھ لی تھی، خاص قابلیت کے مالک تھے ، اس لیے اس زمانے کے ہر زندہ فلسفی سے ملاقات اور اس سے الٰہیات کے نازک موضوعات پر مناظرے اور مباحثے کیے ، جامعہ الازھر قاہرہ بھی گئے اور نامور علماء سے بحث و مباحثہ کیا ، مولانا جب عالمگیر دورہ سے واپس آئے تو وہ بہت شادمان تھے ، وہ سب کو شکست دے کر آئے تھے اور جو شکوک اپنے ساتھ لائے ان پر کئی دن تک مسلسل اپنے سب سے قریبی ساتھی اور رفیق مولانا غلام یحییٰ صاحب سے ، جو ان کے بعد جامعہ الٰہیات کانپور کے شیخ تھے پوری وضاحت سے بحث کرتے رہے ، افسوس کہ ان دونوں نے مل کر فلسفے اور الٰہیات کے جو در بے بہا جمع کیے وہ ایک قیمتی خزانے کی طرح زیر زمین مدفون ہو گئے[۳] ۔

مولوی ظفیر احمد لکھتے ہیں کہ مجھے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۵ء تک کے عرصہ میں کئی بار مولانا آزاد سبحانی کو دور و نزدیک سے دیکھنے اور سننے کے مواقع حاصل ہوئے اور میں اپنی علمی بے مایگی اور کم فہمی کی وجہ سے جو کچھ انھیں سمجھ سکا ، اس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا آزاد سبحانی اپنے فلسفیانہ تصورات کے اعتبار سے برصغیر کے عام علماء کرام سے مختلف تھے ۔ وہ صرف عالم دین ہی نہیں بلکہ ایک فیلسوف اور مفکر تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اسلام کی بھی بڑی فلسفیانہ توجیہات و تشریحات کیا کرتے تھے، جو مجھ جیسے کم علم کے لیے ناقابل فہم ہوا کرتا تھا ۔

انھیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق و محبت تھی اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کے اظہار میں عجیب عجیب نکتہ بیان کرتے کہ سننے والے وجد و کیف میں مبتلا ہو جاتے تھے ۔

ملاحظہ فرمائیں :

"محمدؐ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں وہ بشر کے اوپر ہیں ۔ الوہیت کے مظہر ہیں ۔ خدائی اپنی طاقت سے پوری طرح اس میں جھلکی۔ . . اگر وجود ہے تو وہ صرف محمدؐ ہیں قرآن میں منقبت یا حقیقت ، لیکن ایک بات قرآن خود کہتا ہے اس کتاب کی پوری حقیقت اس وقت تک نہیں کھلے گی ، جب تک کہ قیامت نہ آ جائے۔ . . اور حب۔ . . کا وقت آ جائے گا تو اس وقت حقیقت محمدی کھل جائے گی ۔ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین۔ اس حقیقت سے علماء شریعت پردہ اٹھا دیتے تو نظام توحید درہم برہم ہو جاتا ۔ علمائے شریعت نے اس آیت سے پردہ سرکانے کی کوشش نہیں کی ۔

گویا اقبال کے لفظوں میں :

وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ

ایک جگہ معراج کی حقیقت پر درس دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔ واضح رہے یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ چاند پر نہیں گئے تھے :

" جب لوگ چاند پر چلے جائیں گے تو وہ معراج مہدیؑ کے ظہور عامہ کی سیڑھی ہوگی ۔ محمدؐ نے معراج اس لیے پائی تھی کہ

پوری انسانیت کو معراج ہو ، معراج اس لیے نہیں ملی تھی کہ ایک خاکہ اور ایک کہانی بن جائے ۔ بلکہ یہ حقیقت بن کر رہ جائے اور چاند ، ستارے اور سورج میں پوری انسانیت سما جائے "۔

اور اقبال نے بھی معراج کی اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اپنے درس میں وہ ایک جگہ اللہ ، محمد ؐ اور مسلمان کی حیثیت کا تعین کس طرح کرتے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں :

"جس طرح اللہ کی ایک حیثیت ہے ، اسی طرح مسلمان کی بھی ایک حیثیت ہے"

"اللہ سب سے بڑا"

"محمد ؐ نائب اللہ "

"مسلمان خلیفہ اللہ ۔ نائب محمد ؐ"

غرض وہ قرآن اور اللہ کے لائے ہوئے دین اسلام پر فلسفیانہ انداز میں غور کرتے ہوئے بسا اوقات ایسے مقام پر پہنچے ہیں، جہاں پہنچ کر مولانا کہتے ہیں :

"قرآن میں ایسے الفاظ آئے ہیں اگر ظاہر کر دوں تو پھر میرے دار و رسن کا بھی سامان ہونے لگے - اس لیے شریعت اس حد تک نہیں پہنچتی یا نظام ظاہری شریعت اس کو قبول نہیں کرتا ہے"۔

یہ امر واقعہ ہے مسلمانوں نے فلسفہ سے جان چھڑا کر اپنا بہت کچھ گنوایا اور ہم اس سطح تک پہنچ گئے کہ جہاں کسی نے دین کی فلسفیانہ تشریح و توضیح کی اور ہم تکفیر کا ڈنڈا لے کر اس کا سر پھوڑنے بیٹھ گئے -

فلسفہ سے مسلمانوں کی عدم دلچسپی اور بے اعتنائی کا مولانا آزاد سبحانی کو بڑا شدید احساس تھا - چنانچہ وہ ایک موقع پر اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں :

"مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ فلسفہ کا فقدان ہے - فلسفہ کا زوال امام غزالیؒ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے اس زوال کو مکمل کر دیا ، جب انھوں نے فرمایا کہ منطق قلمون کے ڈھیلے کے برابر ہے - بس کیا تھا مسلمانوں نے فلسفہ کو ٹھکرانا شروع کر دیا اور ان کی عقل کا زوال ہوگیا - ان کے انحطاط کی یہی وجہ ہے - یورپ مر مر کے اٹھا ، اس لیے کہ اس کے پاس زندگی کا ایک فلسفہ تھا یعنی حقیقت کی تلاش گو ساتھ ساتھ عیسٰیؑ کی محفلیں بھی قائم رکھتا تھا لیکن ایشیائی قوموں کے پاس زندگی کا کوئی ایسا فلسفہ نہیں تھا، جس کے لیے وہ جان دے سکیں - یورپ حقیقت

کی تلاش کے لیے جان دیتا رہا"۔

فلسفہ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

"فلسفہ کے معنی ہیں علم الحقیقت۔ ۔ ۔ آزادی کے لیے ضروری ہے ، فہم ، ذوق ، فدائیت ، قربانی"۔

مولانا آزاد سبحانی خود کہتے ہیں کہ فلسفی کے مذاق کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلاب عالم کا ایک نسخہ دنیا کے سامنے رکھ دیا اور اس کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کو اکسایا ۔ دوسری قومیں مسلمانوں سے زیادہ طاقتور ہیں ، اس لیے ان سے جنگ کرنے کے لیے مسلمانوں کو دس گنا ، قوت زیادہ پیدا کرنی چاہیے، ورنہ مقابلہ محال ہے اور نصب العین کی تکمیل ناممکن"[٣]۔

مولانا آزاد سبحانی کے نزدیک مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں تھا ۔ حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں کہ حضرت علامہ (آزاد سبحانی) اس وقت طلبا کو درس دے رہے تھے اور موضوع تھا کہ "سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ہے" ۔ مولانا سمجھا رہے تھے کہ اگر مذہب اور سائنس میں تضاد ہوتا، تو قرون اولیٰ کے لوگ علم و فن کی ترغیب اور اس میں انہماک کی تاکید کیوں کرتے ۔ یہ اسلام کی تعلیم کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے جملہ علوم و فنون میں ترقی کی ۔ چنانچہ امام غزالی[7] احیاے علوم الدین میں فرماتے ہیں :

اب اگر یہ پوچھا جائے کہ جب عقل کا یہ حال ہے (یعنی

بموجب حدیث شریف عقل عرش سے بزرگ تر ہے) تو صوفیہ عقل اور معقول کو برا کیوں کہتے ہیں ، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے عقل اور معقول کو ان کے اصلی معنی میں چھوڑ کر مناظرے اور مجادلے کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اس لیے صوفیہ نے اس کی مذمت کی ہے ۔ ورنہ نور بصیرت جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی جاتی ہے بھلا اس کی مذمت کیسے متصور ہو سکتی ہے ۔ اس کی تعریف تو خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اگر اس کی مذمت کی جائے تو پھر تعریف کس چیز کی ہوگی، کیوں کہ اگر شرع قابل تعریف ہے تو اس کی درستی کا علم کس چیز سے حاصل ہوتا ہے ؟ اگر یہ علم ایسی بری شے یعنی عقل سے ہے ، جس کا اعتبار نہیں تو پھر شریعت بھی بری ٹھہرتی ہے اور اگر کوئی کہے کہ شریعت کی صحت کا علم عین الیقین اور نور ایمان سے حاصل ہوتا ہے تو اس قول پر دھیان نہ دینا چاہیے، اس لیے کہ ہماری مراد جو کچھ عقل سے ہے وہ صفت باطنی ہے کہ جس سے آدمی حیوانوں سے ممتاز ہو جاتا ہے ، یہاں تک کہ اسی کے ذریعے امور کے حقائق کا ادراک کرتا ہے"۔

میں نے یہ عالمانہ ارشادات نوٹ کر لیے تھے ۔ گھر آ کر ان کو صاف کیا اور ایک ہفتہ بعد مولانا کو جا کر دکھائے ۔ خوش ہوئے اور بڑی حد تک تحریر درست ہونے پر شاباش دی۔

ضرورت فلسفہ

سوال : ہزاروں فلسفے اور ہزاروں رائیں ہیں ، تو فلسفہ کا کیا اعتبار . . . . اعتباری کا دلیل ہے - پھر کیوں نہ صرف تجربات پر قناعت کی جائے - کیوں نہ مذہب ، شاعری ، تاریخ وغیرہ پر یوں ہی اعتبار کیا جائے نہ نہ بحث و مباحثہ کی زحمت سے بچا جائے - شعراء ، پیامبر وغیرہ نے ایمان بالغیب کی تلقین کی ہے ، کیوں نہ ایمان بالغیب پر اکتفا کیا جائے ؟

جواب : اگر ان دو سوالوں کے جوابات از روے فلسفہ اطمینان بخش دیے جا سکتے ہیں ، تو فلسفہ کی اہمیت ہے ورنہ فلسفہ کی جڑ و بنیاد ختم - میرے فلسفہ میں بنیادی مسئلہ یہ ہے - غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیل طلب کرنے کی خواہش فطری ہے ، چاہے مذہب ہو یا تصوف و شاعری وغیرہ ہوں - اس واقعاتی کیفیت کے ساتھ ایک ضمیمہ یہ ہے کہ جو خواہش فطری و عالمگیر ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی - اگر فطری خواہش کو غلط و غیر اہم سمجھ کر رد کر دیا جائے ، تو انسانی تصورات و انسانی اعمال کا کوئی نظام باقی نہیں رہ جاتا - خود مذہب کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ حق پر مبنی ہے اور انسان خواہش و ضرورت کے مطابق آیا ہے - خود سائنس بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ سوال یہ اٹھے گا کہ کیوں انکشافات کی زحمت اٹھائی جائے ، کیوں ترقی ہو ، آرام ملے

اور سہولت پیدا ہو ۔ اگر آپ کہیں بھی کہ آرام و سہولت انسان کی فطری خواہش ہے مگر ہم تو سرے سے اس کو مانتے ہی نہیں ۔ یہی حال فنون لطیفہ کا ہوگا ، شادی و موسیقی کا ۔

اہم و غیر اہم کی حد و انفصال کا معیار اسی پر ہے کہ غیر اہم چیز عالمگیر و فطری تخیل کے تحت نہیں آتی لہذا نظام و استبقا کے لیے بھی ہمیں عالمگیر فطری و مسلسل خواہش و ضرورت کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا ۔

اس تسلیم کے بعد فلسفہ کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ فلسفہ نام ہے استدلال ، استنباط اور استغراف کا ۔ اگر یہ صحیح ہے تو فلسفہ عین فطرت کے موافق ہے ۔ کیونکہ دلیل کی طلب اور حقائق اشیاء کو سمجھنا عین فطری ہے ۔ اس بحث سے فلسفے کا ایجابی پہلو پیدا ہوتا ہے مگر دفاعی پہلو نہیں پیدا ہوتا کہ فلسفہ میں اختلافات کا کیا جواب ہے؟ . . . . . مگر اختلاف دلیل غلطی نہیں مگر دلیل ہے اختلاف نظر کا اور نا کاملیت نظر کا اور ناقصیت نظر ۔ اختلاف نفس حقیقت کے مقام میں نہیں بلکہ نفس فکر میں ہے ۔ اگر فلسفہ کی چند شاخیں ٹکرا رہی ہیں تو دلیل یہ ہے کہ اس کے یہ مظاہر اور شاخیں ناقص نہیں مگر نفس فلسفہ غلط ہے ۔ ناقص فکر و نظر کی وجہ سے حقائق اشیاء کے کل پہلو نظر نہیں آتے مگر صرف جزوی نظر آتے ہیں جن میں اختلاف ہے ۔

اگر کوئی فلسفی ان جملہ شاخوں کو کسی کلی اصول کے ماتحت جمع کر سکتا ہے ، تو یہ تصادم ختم ہو جاتا ہے اور یہ تصادم و اختلاف دلیل ہے ایک حقیقتِ کلی کی موجودگی کی ۔ کیونکہ کوئی حقیقت کلی ہے ، جس کے یہ پہلو ہیں ۔ لہذا اختلاف سے فلسفہ کی تکذیب غلط ہے ۔ صحیح دلیل اختلاف کی یہ ہے کہ فلسفہ بھی کوئی وقعی اور حقیقی چیز ہے ، جس نے اتنے مظاہر کو منصۂ شہود پر لا کر کھڑا کر دیا ۔

اختلاف سے یہ دلیل بھی نکلتی ہے کہ فلسفہ ابھی درمیانی منازل میں ہے اور وہ ابھی تک منزل آخر تک نہیں پہنچا مگر یہ داد دینی پڑے گی کہ اس نے اتنی مسافت طے کی مگر یہ نقص و درجۂ کمال کی کمی جملہ شعبۂ حیات میں ، علمی خواہ عملی میں پائی جاتی ہیں ۔ سائنس، مصوری، موسیقی، شاعری وغیرہ سب کا یہی حال ہے ۔ یہی حال مذاہب کا ہے ۔از روئے تفصیل وہ نیز درمیانی منزل میں از روئے حقائق اعلیٰ ، حقائق ادنیٰ ، ہزاروں مسائل ناطے شدہ ہیں ۔

لہذا دلیل طلبی فطری چیز ہے اور اختلافِ فلسفہ صرف نقص کی دلیل ہے ۔ ان دو کو ملانے سے فلسفہ کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے ۔

فلسفہ سے سائنس ، ادب اور علوم سب کی قیمت و وقعت بھی معلوم نہ ہوتی ۔ لہذا باوجود ہزاروں اختلافات کے اس

نے با وقعت قدریں (Values) قائم کر دی ہیں تو اس کا اتنا
کارنامہ بھی قابل قدر ہے ۔

سوال : اگر اختلافات مختلف جہات و اطراف کے مختلف بیانات ہیں
تو وہ کونسا فلسفہ ہے کہ ان جملہ آراء کو اور نظریات
کو ایک اصول کلی کے ماتحت جمع کر دے اور ان سب میں
ربط پیدا کرکے ان کو آخری درجہ کی حقیقت کلی سے ہم
رشتہ بنا دے اور ان جہات مختلفہ میں ہم رنگی و یکسانیت
پیدا کر دے ؟

جواب : بجائے انتظار و تجسس و تلاش کے زیادہ آسان ہے کہ میں
خود فلسفۂ کلی پیش کر دوں ۔ ایک فلسفہ مطلق و کلی کو
ایجاد و اختراع کروں ، جو تمام جزئی فلسفوں کو جو غیر
مربوط ہیں ان سب کو مربوط کرکے رکھے ۔ یہ فلسفۂ
ربانیت ہے ۔ اس فلسفہ کا ایک یہ دعویٰ و مدعا بھی ہے ۔

سوال : کیا امکان ہے کہ فلسفۂ ربانیت کو بحیثیت فلسفۂ کلی از میان
دیگر فلسفہ ہائے جزئی کھڑا کیا جا سکتا ہے ۔ فلسفۂ ربانی
کا وہ کونسا نظریہ و تشریح ہے ، جو اس بنیادی خصوصیت
کو ظاہر کر سکتا ہے ؟

جواب : یہ ممکن ہے کہ تمام فلسفوں کو جزئی ثابت کرکے فلسفۂ
ربانیت کو بطور فلسفۂ کلی پیش کیا جائے اور اس فلسفہ میں
ان جزئی فلسفوں کا ربط ثابت کیا جائے ۔

۱ - کوئی فلسفہ آج تک ثابت نہیں کر سکا کہ ان کے مخصوص مسائل جو دوسرے فلسفوں سے ٹکراتے ہیں درجۂ کلی رکھتے ہیں۔ ان مخصوص مسائل کے متعلق اس فلسفہ کی رائیں اپنے مخالف آراء کے لیے امکان نہیں چھوڑتیں ۔ یہ ثابت نہیں ہو سکا ۔

۲ - جب کوئی غیر جانبدار مفکر ان مخصوص مسائل پر ایک غیر جانبدارانہ نظر فکر ڈالتا ہے، تو اس کو ایک خاص فلسفہ کی مقرر کردہ رائیوں کے خلاف دوسری رائیوں کا امکان نظر آتا ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ہو سکتا ہے ۔

۳ - اگر ایک فلسفہ نے مخصوص مسائل میں اپنی رائیں قائم کرنے کے لیے دلیلیں قائم کیں تو بالمقابل دوسرے فلسفہ نے خلاف رائیں پیدا کرنے کے لیے دلیلیں قائم کر دیں ، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مخالف رائیوں کے لیے بھی امکان موجود ہے ۔ ان دلیلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر جانب دار مفکر کے لیے دوسری آراء کا امکان باقی ہے - اگر امکان باقی ہے ، تو ربط کا امکان بھی ہے -

سوال : وہ کیا تخیل ہے جو فلسفۂ ربالیت کے ایک اس امکانی قیاس کو واقعاتی امکان تک پہنچا دے ؟

جواب : فلسفہ کو لوگوں نے دو طریق سے لیا ۔

۱ - ایک چیز مروج کو مان لیا اور پھر اس میں تنوعات پیش کیے -

۲ - دوسروں نے اپنی فکر سے قالب بنایا -

۳ - تیسروں نے اپنے اور دوسروں کے افکار کو ملا کر قالب تیار کیا -

۴ - چند بزرگوں نے بغیر فکر کے روحانی انکشافات سے جو کچھ ان کو ملتا گیا ان سے قالب تیار کیا -

۵ - مذہب کو بنیاد قرار دے، کر مذہب کے اصولوں کی تفصیلیں کیں اور فلسفہ تیار کیا - زیادہ تر فلسفے ان شکلوں سے تیار ہوتے رہے - ایک کمی فلسفیت مطلق کے لحاظ سے جو ان میں رہ گئی وہ یہ کہ بجائے تحقیق کلی کے صرف تقلید کی آمیزش سے تسلیم و اعتراف کی بنیاد سے تحقیق ناقص رہ گئی -

دوسری چیز یہ . . . . تھوڑے مبلغ علم کی وجہ سے حقیقت سے زیادہ کام انجام دیا گیا - لہٰذا تحقیقات سطحی ہو کر رہ گئی، کیونکہ پوری فکر روشن نہیں ملتی تھی -

(اب فلسفۂ رہبانیت میں درجۂ کلی کا ثبوت اس تاریخ ، ابتدا و ارتقاء فلسفۂ رہبانیت سے ملتا ہے) -

میرے فلسفہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ مسلسل مطالعے اور فکر کی وجہ سے بالکل فطری طور پر میرے دماغ نے وجود الٰہی کا انکار کر دیا - نہ صرف انکار کر دیا بلکہ یہاں تک پہنچا کہ وجود الٰہی قطعی طور ہو نہیں سکتا - یہ وہ زمانہ تھا کہ میر مدرسۂ الٰہیات

میں فاضل طلبہ کو درس دے رہا تھا ۔ ایک طرف وحود الٰہی کے ثبوت کا اور دین وجود کا ۔ اس وقت صداقت یہ کہتی تھی کہ اس درس کو ترک کر دو۔ مگر حکمت یہ کہتی تھی کہ انتظار کرو اور کم از کم اس سے ان طلبہ کو فائدہ ہو رہا ہے یہی کافی ہے ۔ اس کے بعد یہ کیفیت بڑھتی گئی حتیٰ کہ میں نے دوسری ہستیوں کا بھی انکار کر دیا حتیٰ کہ اپنی حیثیت کا بھی انکار کر دیا اور جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی ۔ ایک لقمہ اٹھاتا تھا، تو گھنٹوں تک چباتا تھا اس بے چینی نے آرام کی تلاش کی ۔ اس آرام اور تسکین کی تلاش نے تصوف کا مطالعہ شروع کیا ۔ خاص کر ابن عربی کی فصوص، عبدالکریم الجیلی کی الانسان الکامل ، ابوطالب مکی کی قوت القلوب ، شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف ، مجدد الف ثانی[7] کے مکتوبات ۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے صرف اتنا ہوا کہ یہ بزرگ اور ان کی کتابیں دلچسپ ہیں اور دلچسپی کی وجہ سے مطالعہ جاری رہا ۔ اس سے بے چینی ختم ہوئی اور یہ خیال آیا کہ کسی صوفی کو تلاش کروں اور خیال ہوا کہ اسی شہر کانپور میں جو پہلا صوفی ملے گا اس سے بیعت کروں گا ۔ صرف آزمائش کے لیے کہ کہاں تک اس نے علمی صورت میں وہ کیفیتیں حاصل کی ہیں ، جو کتابوں میں لکھی ہیں ۔ اس نقطۂ نظر سے مولانا ضیاء الرحمٰن سے کانپور میں پہلی ملاقات میں اس شرط پر بیعت کی ۔ اگر آپ مجھے تعلیم سے مطمئن نہ کر سکے، تو میں آپ کی تعلیم فسخ کر دوں گا اور اگر آپ کی قابلیت حد کو پہنچ گئی، تو میں کسی دوسری ہستی کی تلاش کروں گا ۔ بہرحال وہ اپنے دعویٰ میں (سچے) ثابت ہوئے اور ان سے تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے . . . . کے مزار پر خود کو رجوع کیا اور

ڈیڑھ سال تک ان کے مزار پر اعتکاف کرتا رہا ۔ اس سے یہاں تک تجلی حاصل ہو گئی کہ صرف ذات باری تعالیٰ کی رہ گئی ۔ مگر آخری کیفیت جو مجھے ملی وہ اتنی خطرناک تھی کہ صرف موت یا جنون کو اختیار باقی رہ گیا ۔ اس لیے پھر گزارش کی کہ اعتدال پیدا ہو ۔ اعتدال پیدا ہوا اور اس سے میرے سب شکوک ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ میری فکر کی قوت نیز ختم ہو گئی اور صرف جذبہ رہ گیا ۔ یہ بنیاد تھی میرے اعتقاد خداوندی اور مذہب کے لیے ۔ اس کے بعد آج تک میں مذہبی آدمی ہوں اور مدت تک مذہبی آدمی رہوں گا ۔ مگر یہ مایوسی طاری ہو گئی کہ فکر کی طاقت سلب ہو گئی کہ شاید آئندہ میں فلسفی نہ رہ سکوں ۔

مگر اس کے بعد قومی زندگی کا انقلاب جاری ہوا، جس سے میں نے قوتِ فکری کو پا لیا ۔ مگر اب وہ ماتحت تھی میری روحانی نوت کے ۔ مگر وہ ذہنی طور پر ماتحت نہیں ۔ مگر کیفی طور پر ماتحت تھی ۔ اس کے بعد مجھ میں فلسفیتِ حقاً (کامل) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ب میں کامل فکر بھی کر سکتا تھا اور اس کے ساتھ کشف بھی اور اسفیتِ کامل کی تخلیق بھی یہی ہے کہ ذہن اور روح کے ساتھ ساتھ ام کروں ۔

مگر اشتعال قوی کے باعث کام نہ کر سکا ۔ بالآخر موقع ملا ر جیل خانہ میں (۶ مہینہ) قدرت کی عنایت سے فلسفہ کا کام شروع سکا اور اس زمانہ میں ، میں نے فلسفۂ رہانیت کی بنیاد ڈالی ونکہ میں دوسرے تمام فلسفوں سے بغاوت کر چکا تھا ۔ کیونکہ وہ

ناقص تھے اور ساتھ ساتھ فلسفۂ تصوف کو بھی میں کامل نہیں سمجھتا تھا، کیونکہ وہ ذہنی قوت سے محروم تھا اور فسلفۂ رہانیت کا قوام ترکیبی یہ تھا کہ کشف روحی اور فکر ذہنی مل کر کام کریں اور متحدہ انکشاف کو حاصل کریں ۔ فلسفۂ رہانیت کا آغاز اور انجام میرے ذاتی فکر سے مکمل ہوا بغیر مذہب یا دعوائے تصوف کی مدد سے ، یا کسی فلسفۂ غیر کی تقلید سے ۔ البتہ بعد تکمیل فلسفۂ رہانیت یہ تخیل ذہن میں آیا کہ مذہب اسلام جو کامل ترین مذہب سمجھا جاتا تھا اور میرے نزدیک کامل ترین فلسفہ اور کامل ترین مذہب دونوں کو ایک چیز ہونا چاہیے تھا ۔ لہٰذا مذہب اسلام کا مطالعہ نئے سرے سے شروع کیا تاکہ دیکھوں کہ میرے فلسفہ اور مذہب اسلام میں کہاں تک درجۂ کلی تک تطبیق ہے ۔ قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا اور چھ مہینے کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ فلسفۂ رہانیت اور مذہب اسلام کلیاتی درجہ پر ایک ہیں . . . . میں نے مذہب اسلام کو فلسفۂ رہانیت کے ساتھ منسلک کر دیا اور فلسفۂ رہانیت کو مذہب اسلام کے ساتھ متحد کر دیا ۔ لہٰذا فلسفۂ رہانیت کامل تحقیقی فلسفہ بھی ہے اور مذہب اسلام کے لیے تطبیقی فلسفہ بھی ہے ۔ مگر تقلیدی نہیں ہے ، لیکن میں مذہب اسلام کو فلسفۂ رہانیت کے رنگ تقلیدی کے طور پر بھی ماننے لگا ۔ یہ سمجھ کر کہ میری تحقیق فلسفی نے بھی مذہب اسلام کو مکمل مذہب و مکمل فلسفہ یقینی کر لیا ہے ۔

دنیا میں آج کل ایک بے چینی سی پائی جاتی ہے، اس کے بارے میں آپ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کیا فرمائیں گے ؟

. . . . ایک بے تنظیمی و بے ترتیبی عالمگیر ہوگئی ہے ۔ ہر

قوم و ہر گروہ مضطرب ہے ۔ لہذا نہ صرف مذہبی و روحانی نقطہ نظر سے بلکہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی یہ حالت اطمینان بخش نہیں ۔

(ادراک مجمل کیا ہے ؟)

. . . . ادراک مجمل فطری چیز ہے۔ ادراک مجمل کسبی (ہے) ادراک مجمل کا درجہ اول ہے، اس کے بعد ادراک مفصل آتا ہے ۔

. . . . کلیات کیا ہیں ۔ (کیا یہ) ادراکات مجمل ہیں ؟

. . . . کلیات ادراکات فطری و مجمل ہیں ۔ لہذا جزئیات پر ان کو فوقیت ہے ۔ جزئیات میں خطا کا زیادہ امکان ہوتا ہے ۔

. . . . (منطق سے کیسے مدد لی جائے ؟)

. . . . پہلے رائے قائم کرو ۔ مگر اس کی بنیاد منطق و وجدان اور ادراک پر ہو ۔ منطق سے مدد لی جائے فکر کے راستہ کو صحیح رکھنے کے لیے ۔

. . . . (ادراک سے کیا استفادہ کرنا چاہیے ؟)

. . . . ادراک و شہادت ادراک سے اصل علم و اصل تخیل کو سمجھنا چاہیے ۔ حقیقت اصلی مواد کو جمع کرنے کے بعد نہ سوچنا چاہیے کہ نہیں حاصل ہوتی ۔

. . . . علم نام ہے قوت ادراک کا نہ کہ ادراکات کا ۔

. . . . انسان کتاب اور عبارت بھول سکتا ہے مگر علم کیسے بھول سکتا ہے ۔

. . . . فرمایا ، صحیح اور غلط کوئی چیز نہیں ہے علم میں ۔

ایک نقشہ دماغ میں قائم ہوتا ہے جو بدل جاتا ہے ۔ ایک گھر میں آپ رہتے تھے اور اب گھر گر گیا ۔ نہ پہلے صحیح تھا نہ اب غلط ہے ، کیونکہ آپ اس میں رہتے تھے لہٰذا اس کو صحیح سمجھتے تھے ۔ اب گرنے کی وجہ سے اس کو غلط سمجھتے ہیں ۔

. . . . فرمایا کہ ایک علم ہے اور ایک مقصد ہے ۔ علم کو مقصد کے خانے میں نہ گھسنے دیا جائے اور نہ مقصد کو علم کے خانے میں ۔

. . . . (علم تنقید) ۔

. . . . فرمایا کہ علم تنقید سب میں اعلیٰ علم ہے ۔ علم تنقید کے سامنے صحیفۂ الٰہی نیز اڑ جاتا ہے، لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ غلط ہوگیا ۔

. . . . فرمایا کہ علم کے بدیہیات تو بحث سے خالی ہیں ۔ مثلاً دو دو چار مگر دوسرے شعبوں پر علم تنقید حاوی ہے ۔

. . . . فرمایا کہ فلسفہ نصف تحقیق و نصف تنقید ہے ۔

فلسفہ داں وہ ہے جو فلسفہ کے مسائل کو جانتا ہے ۔ فلسفی وہ ہے جو تحقیق و تنقید کا علم رکھتا ہے ، اس کو خواہ مسائل یاد ہوں یا نہ مگر تنقید کرے تو غیر معمولی تنقید کرکے رکھ دے ۔ اگر تحقیق کرے تو وہ بھی غیر معمولی کرکے رکھ دے ۔

تنقید کے مقدمات

جیسے سائنس والے تجربات کو درجۂ اول میں رکھتے ہیں، اس طرح تصوف والے واردات کو درجۂ اول میں رکھتے ہیں، کیونکہ

واردات کا تعلق عالم علوی سے ہے ، مگر واردات وہ قیمتی ہیں جو علم فکری سے علانیہ تصادم نہ کریں مگر ان کو بلند کریں ۔ واردات قبیلۂ الہامات میں سے ہیں ۔

علم تنقید

۱ ۔ اللہ و نبیؐ کو چھوڑ کر تقلید کو بشرط حکمت نکال دینا چاہیے ۔

۲ ۔ اس کے لیے جرأت کی ضرورت ہے ۔ مگر جرأت بہت ضروری ہے ۔ جرأت کے لیے پہلے تکلیف ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ علمی مردانگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ عادت قدیم کی وجہ سے اور اس کار جرأت کی وجہ سے شکستیں بھی ہوتی ہیں ۔ مگر ارادۂ جرأت کی تکمیل کے لیے مستقل ارادہ کی ضرورت ہے ۔

۳ ۔ جرأت کے ساتھ محنت فکری نہایت ضروری ہے، ورنہ جرأت بھی عامیانہ ہو جائے گی جہالتِ تقلید کی طرح ۔

۴ ۔ جرأت و محنت فکر کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے اگر ان میں جدائی ہوگی تو بھی ۔

۵ ۔ نظرثانی

ہر جرأت و فکر کے مرحلہ پر نظرثانی کرنی چاہیے لتوجہ فکر پر ۔ بغیر اس نظرثانی کے ابتدائی غلطی کو متواتر تکرار ہوگا اور نظرثانی کے ساتھ ساتھ تصحیح ہوتی رہے گی ۔ اس کے بعد فکر ثانی اور فکر ثالث (کا حصول ہوگا) ۔

۶ - تنقید ذات و للذات

ایک تنقید ہے غیر پر ایک ہے آپ پر - تنقید غیر سے پہلے تنقید پر ذات ہونی چاہیے - اس کے سوا تنقید جاہلانہ ہوگی اور بجائے تعمیر کے تخریب پیدا کرے گی -

۷ - طریقۂ فکر و ذریعۂ فکر

جرأت و محنت، فکر و نظرثانی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ فکر کا ذریعہ کیا ہے ، یعنی کہ مواد و میٹریل کون سا موجود ہے، یا ہے مگر غلط ہے یا صحیح مگر ناقص ہے، اس لیے ذریعۂ فکر مہیا کرنا چاہیے صحیح اور بے حد مکمل -

طریقۂ فکر

اگر ذریعۂ فکر بھی موجود ہے مگر صحیح طریقۂ فکر نہیں ، تو بھی غلط نتیجہ پر پہنچیں گے، کیونکہ بسا اوقات موادِ فکر ہونے کے باوجود طریقۂ فکر غلط داخل ہو جائے (تو) اس طریقۂ فکر غلطی سے نہیں بچا سکتا -

۸ - صداقت و دیانت

فکر میں اگر آپ کاذب وخائن ہیں اور اپنے فکر کے ذریعے نمائش افتخار و انتقام و بیجا تنقید کا مقصد رکھتے ہیں تو آپ کی کاذبیت و بد دیانتی آپ کو غلط راستے پر لے جائے گی باوجود جملہ تحقیق کے -

صداقت کا ایک معیار و نتیجہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ کو اپنے نتیجۂ فکر کے متعلق کافی محنت کے باوجود یہ علم ہوگیا ہے کہ وہ

غلط ہے، تو آپ میں اس کو رد کر دینے کی قوت ہونی چاہیے - ہٹ دھرمی کبھی نہ ہونی چاہیے ورنہ اگر یہ عادت پختہ ہوگئی، تو آپ کوکبھی حق کی طرف نہ لے جائے گی - یہ جہالت دانستہ، جہالت نادانستہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ جہالت غیر دانستہ، نادانستہ خودکشی ہے مگر اس میں تصحیح کی گنجائش ہے اور جہالت دانستہ، دانستہ خودکشی ہے -

میں نے اس اصول پر عمل کیا اگر مخالف کی حق بات ہے، تو اس کو رد کرکے غلط بات نہیں کی - مگر اس سے اعلیٰ بات نکالنے کی کوشش کی اور کہا کہ مخالف کی رائے صحیح تو ہے، لیکن ادنیٰ ہے اور یہ ہماری رائے اعلیٰ ہے -

تنقید کیوں کر ہونی چاہیے

۱ - مسئلۂ تنقید (جس پر تنقید کی جا رہی ہو) کا وسیع اور عمیق اور مطابق حقیقت علم حاصل کرنا (چاہیے) اس کے سطحی علم پر کبھی اکتفا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا نشانہ ہے عمیق اور آپ سطح پر بے کار تیر مار رہے ہیں -

۲ - اس تحقیق میں مسئلہ کو مجرد نظر سے دیکھنا چاہیے اور شخصیت کو قطعی نظر انداز کر دینا چاہیے - چھوٹی یا بڑی شخصیت کو کبھی نظر (میں) نہیں لانا چاہیے -

۳ - علم کو ہمیشہ منقسم سمجھنا چاہیے، علم اعلیٰ اور علم ادنیٰ - ہر مسئلہ علم اعلیٰ و علم ادنیٰ کے نقطۂ نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہے -

۴ - علم اعلیٰ اور علم ادنیٰ کی مطابقت ہر جگہ لازمی نہیں ہے۔ بعض حالات میں اختلاف بھی رکھ سکتے ہیں ۔ نہ صرف اختلاف درجہ بندی (یعنی مختلف مگر تردید نہیں کرتے) مگر اختلاف اضداد بھی رکھتے ہیں ۔

۵ - مسئلہ زیر تنقید کو باری باری دونوں علم کے ذریعے پرکھنا چاہیے۔ اگر دونوں علموں کے ذریعے مسئلہ صحیح ثابت ہوتا ہے ، تب اس کی صحت کو قبول کرنا چاہیے ۔ اگر کسی ایک قسم کے ذریعے بھی اس کی صحت مشکوک یا مخدوش نظر آتی ہے، تو اس کی صحت نہ قبول کرنی چاہیے کلی طور پر ، البتہ جزئی طور پر قبول کی جا سکتی ہے ۔ اگر علم اعلیٰ کی وجہ سے صحیح ہے تو وہ نصف صحیح ہے۔ اگر علم ادنیٰ کی وجہ سے صحیح ہے تو بھی نصف صحیح ہے ۔ اگر دونوں کے اعتبار سے صحیح ہے تو کلیتاً صحیح ہے ۔

علم ادنیٰ

وہ علم جو بہ لحاظ وقت طبقۂ عوام و طبقۂ متوسطین اہل علم میں مقبول و مسلم ہے (بلحاظ وقت یعنی بلحاظ زمانے کے ، کیونکہ علمی تخیل زمانہ بزمانہ بدلتا رہتا ہے)

علم اعلیٰ

وہ علم جس کو عوام و متوسطین اہل علم تسلیم کرتے ہوں یا نہ مگر علم کا طبقہ اعلیٰ (خواص) تسلیم کرنے کی طاقت رکھتا ہے ، ان کا تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے ۔کیونکہ بعض مسائل ایسے

ہیں کہ طبقہ اعلیٰ بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا ۔ چونکہ نہیں سمجھتے مگر مسائل میں قوت ہے کہ اگر سمجھائے جائیں تو خواص اس کو مان لیں گے ۔

علم الاسرار

وہ علم جس کے سمجھنے کی قابلیت خواص میں بھی نہیں وہ علم الاسرار ہے یا علم فوق الاعلیٰ ہے ۔ اس کی صحت کا معیار علم میں نہیں بلکہ صرف ذوق میں ہے ۔ مثال کے لیے قصہ سلطان العارفین با یزید بسطامی اور مولانا روم کو مدنظر رکھا جائے (جس کا ذکر آئندہ سطور میں کیا جا رہا ہے) . . . . ایک دفعہ اولیاء اللہ با یزید کے ہاں جمع ہوئے کہ علم معرفت کے کسی مسئلہ پر تقریر کی جائے ۔ بایزید نے پہلی تقریر کی اور اولیاء اللہ کو سمجھ میں نہ آیا ۔ ساتویں تقریر میں سمجھ آیا تو با یزید نے کہا کہ میں اس مسئلہ کو سمجھانے کے لیے سات درجے نیچے اترا ہوں ۔ تو یہ علم فوق الاعلیٰ ہے (جو بایزید کو حاصل تھا) ۔

. . . . شیخ مجدد (الف ثانی) سرہندی[7] نے مسئلہ بیان کیا ہے (بطور حجت نہیں مگر بطور مثال کے) کہ عارف کامل المعرفت میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ عدم کو وجود کے رنگ میں رنگین کر سکتا ہے ۔ یہ علم الاعلیٰ سے بھی اعلیٰ ہے کیونکہ یہ خصوصیات الٰہی میں سے ہے ۔

رابعہ بصری

ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی لیا اور کہا کہ میں

جنت کو پھونکنے اور دوزخ کو بجھانے جا رہی ہوں۔ پوچھا گیا کیوں؟ فرمایا، کیونکہ دنیا مشرک بن گئی ہے اور خدا کو مانتی ہے جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے نہ کہ خدا کو خدا کے لیے۔ نیز رابعہ کہتی ہیں کہ میں نے محمد[۳] کو مانا خدا کی خاطر۔ اس کی تردید مجدد الف ثانی نے کی ہے کہ یہ مستی کا کلام میں ہوش کا کلام یہ کہتا ہوں کہ میں نے خدا کو مانا محمد[۳] کی خاطر۔ حضرت مجدد پر محمدیت یا نبوت غالب تھی اور رابعہ پر الوہیت:

کار عمرش کسی تمام نکرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید[۶]

حواشی باب چہارم

روزنامہ جنگ، راولپنڈی
تحقیقات: ۱۱۲
شب چراغ: ۱۱۹ - ۱۲۰
روزنامہ جنگ، راولپنڈی، تحقیقات: ۱۱۳ - ۱۱۴
- شب چراغ: ۱۱۸
- مولانا آزاد سبحانی کے فلسفہ و تنقید سے متعلق دو غیر مطبوعہ تحریریں جو راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔

باب پنجم

دین داری و دینی خدمات

اگست ۱۹۱۳ء میں جب مچھلی بازار کانپور کا المناک سانحہ ہوا، تو مولانا اس مدرسہ سے متعلق تھے۔ مسٹن روڈ کانپور پر واقع اس مسجد کے ایک حصہ کو ڈھا کر حکومت سڑک کو کشادہ کرنا چاہتی تھی۔ اس سے متصل جو مندر سڑک کے بیچوں بیچ واقع تھا حکومت نے اس سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ مسلمانان کانپور کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ مسجد کے سانحہ سے ایک روز قبل مولانا آزاد سبحانی کی ولولہ انگیز تقریر نے مسلمانوں میں آگ لگا دی اور مسجد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ مسلمان مرد، عورتیں، بچے مسجد میں جمع ہو گئے۔ وہ مسجد چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ جس پر ٹائگر Tiger نامی مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ سینکڑوں مسلمان مرد، عورتیں، بچے شہید ہوئے . . . . اس سانحہ نے سارے ملک میں ہیجان برپا کر دیا۔ سر جیمس مسٹن اس وقت یو پی کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ مسلمانوں نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کی جس میں ملک کے نامور مسلمان قانون دان شامل تھے۔ ان میں سر شاہ محمد سلیمان، مظہر الحق، ناظر حسن بیرسٹر لکھنؤ

اور سر راس مسعود خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مولانا محمد علی ایک مشن کے سربراہ کی حیثیت سے لندن گئے اور انھوں نے انگریز عوام کو اس سانحہ سے متعلق ظلم و تشدد سے آگاہ کیا ، جس سے حکومت برطانیہ سخت پریشان ہوئی ۔ گرفتار ہونے والوں کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا ۔ مرنے والوں کو خاطر خواہ معاوضہ دیا گیا اور مسجد ڈھانے کے بجائے سڑک کا فٹ پاتھ مسجد کے نیچے تعمیر کیا گیا ۔ اوپر مسجد کا وضو خانہ تھا اور نیچے فٹ پاتھ ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس سانحہ پر ایک معرکہ آراء نظم لکھی جس کا ایک مصرع ہے :

"ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں"

مولانا آزاد سبحانی بعد ازاں مسجد الٰہیہ کانپور سے الگ ہوگئے اور تحریک خلافت میں شامل ہوگئے[1]۔

مولانا ہمہ تن دینی اور تدریسی کاموں میں مصروف تھے کہ کانپور میں ایک ایسا حادثہ ہوا، جس سے پورا برصغیر متأثر ہوا اور مولانا مسندِ درس سے اٹھ کر میدانِ سیاست میں آ گئے ۔ میونسپل کمیٹی کے کار پردازوں نے ایک سڑک بنانے کی خاطر مچھلی بازار کی مسجد کا کچھ حصہ منہدم کرا دیا، جب کہ ایک مندر کو انہدام سے بچانے کے لیے سڑک کے نقشہ میں تبدیلی کر دی گئی تھی ۔ مسجد کی شہادت سے مسلمانانِ کانپور سراپا احتجاج بن گئے ۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد کی سرکردگی میں ایک بڑا جلسہ ہوا ۔ جلسہ کے اختتام پر ہجوم نے مسجد کا رخ کیا اور منہدم دیواروں پر اینٹیں

چننے لگے - قانون کے محافظوں نے گولی چلا دی اور چند نوجوان خون میں لت پت ہو گئے - اس خونیں حادثے کی بازگشت پورے ملک میں سنی گئی - اخبارات نے سراپا احتجاج اداریے لکھے اور جگہ جگہ حکومت کے رویے پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی - مولانا آزاد سبحانی اور ایک سو سے زائد دوسرے افراد گرفتار کر لیے گئے - مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے سرکردہ مسلمان رہنماؤں نے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آخر ایک معاہدہ کے تحت مسجد کا مسمار کردہ حصہ تعمیر ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد رہا ہوئے[۲]۔

اس واقعہ سے مولانا آزاد سبحانی کی شخصیت پورے ملک میں متعارف ہو گئی - اخبارات میں ان کے پرعزم رویے کی تعریف کی گئی - اس کے بعد مولانا سبحانی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے - انجمن خدام کعبہ میں شامل ہوئے اور لاہور میں وہی اس انجمن کے کرتا دھرتا تھے - فروری ۱۹۱۴ء میں انھوں نے یو پی کے مشرقی حصہ اور بہار کا دورہ کیا تھا[۳]۔

جنگ بلقان ابھی جاری ہی تھی کہ مسلمانانِ ہند کو ایک نئے سانحہ سے دوچار ہونا پڑا - ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کو حکام کانپور کے ایما سے منہدم کرکے سڑک (مسٹن روڈ) کا جزء بنا دیا گیا - مسلمانوں کی فریادیں ، مظاہرے ، احتجاجات سب نظر انداز کر دیے گئے - مسلمانوں کے غم و غصہ کے بارے میں حکام بالا (مرکزی سرکار) کو غلط اطلاع دی گئی اور صوبائی گورنمنٹ نے یہ اعلامیہ جاری کر دیا کہ مسجد کے

معاملہ میں مسلمانانِ کانپور میں کوئی اضطراب نہیں ہے ۔صوبائی حکومت اور مقامی حکام کے طرزِ عمل سے مسلمانانِ کانپور کو سخت صدمہ پہنچا ۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد سبحانی نے عید گاہ کے میدان میں پچاس ہزار فرزندان توحید کے سامنے ایک مدلل ، بصیرت افروز اور پُرجوش تقریر کی۔ آپ نے حکامِ شہر اور صوبائی حکومت کے الزامات کی تردید کی کہ مسلمانوں میں جوش و خروش اور مسجد کے لیے موجودہ ہیجان سلطان ترکی کی در پردہ معاونت کی وجہ سے ہے[۴-۵]۔ تفصیل ''باب دوم'' میں مچھلی بازار کانپور والی مسجد کے تحت درج ہے ۔

مولانا آزاد سبحانی کی تقریر کے بعد مسلمانانِ کانپور مسجد کے تحفظ اور مذہب کے دفاع کے لیے بے چین ہو اٹھے ۔ ٹائلر (ضلع مجسٹریٹ) کے احکام پر، پُرامن مسلمانوں کی تحریک کو گولیوں کی بارش سے روکنے کی کوشش کی گئی ۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے ، مسجد کے اندر بھی مسلمانوں کو نہیں بخشا گیا ۔ مسجد مسلمانوں کے خون سے بھر گئی[۶]۔ مسجد کانپور کے واقعہ نے شمالی ہند کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی ۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور ان کے رفقاء گوشہ نشینی ترک کرکے ، دین کے تحفظ کے لیے میدان میں آ گئے[۷]۔ مولانا آزاد سبحانی پر باغیانہ تقریر کرنے کی فرد جرم عائد کی گئی اور وہ نذرِ زندان کر دیے گئے[۸]۔ مولانا پر مقدمہ چلا اور سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیے گئے۔ دورانِ مقدمہ ، حکومت برطانیہ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور ان کے رفقاء کی جد وجہد ، تحریک ، قومی اور بین الاقوامی مصلحتوں سے مجبور ہو گئی ۔ مولانا آزاد سبحانی

نومبر ۱۹۱۳ء میں باعزت طور پر قیدِ فرنگ سے رہا کر دیے گئے۔

مولانا کے مقدمہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ دورانِ اسیری اور مقدمہ، مولانا کی مکمل فائل وائسرائے کے ملاحظہ کے لیے صوبائی حکومت نے بھیجی۔ ملاحظہ کے بعد وائسرائے نے ہوم سکریٹری کو اپنے نوٹ میں مولانا کی تقریر کو بہت اشتعال انگیز اور انگریز دشمن لکھتے ہوئے، حکومت یو پی کے متعلق یہ تاثر دیا:

> "It is also clear what an admirable weapon for agitation the U.P. Government placed in the hands of Mohammadans when it stated in its communique about the mosque that there was little or no excitement in Cownpore itself."

مندرجہ بالا نوٹ کے بعد سکریٹری ہوم نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو تحریر کیا کہ " کوئی کارروائی نہیں" اور بعد ازاں مولانا کی رہائی عمل میں آئی۔ ملاحظہ ہو:

Home Department-Poll . (B) No,70-74, November. 1913
National Archives, New Delhi

مسجد کانپور کے حادثہ اور مشرق وسطیٰ میں روز افزوں بیرونی مداخلت کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے علاوہ دوسرے علماء بھی سرگرم سیاست ہو گئے[۹]۔ مولانا آزاد سبحانی نے بھی اب باقاعدگی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا شروع

کر دیا ۔ آپ بڑی حد تک خصوصاً اس دور میں ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے متاثر تھے[۱۰]۔

بحث و مناظرہ الٰہیات

مولانا آزاد سبحانی "الفیلسفوف الہندی" ہونے کے اس دعوے کے ساتھ مدعی تھے کہ دنیا کا کوئی فلسفی اور کسی مذہبی منطق کا کوئی بھی عالم کسی موضوع پر ان سے مقابلہ کرے اور ایسا ہی ہوا ، وہ اپنے اس دعوے کے ساتھ ممالک عرب ، یورپ اور امریکہ تک کچھ عجب شان فقیرانہ سے چکر لگا آئے اور چونکہ عربی اور فارسی کے منتہی اور انگریزی میں ، جو انھوں نے جیلوں میں رہ کر پڑھ لی تھی خاص قابلیت کے مالک تھے ، اس لیے اس زمانے کے ہر زندہ فلسفی سے ملاقات اور اس سے الٰہیات کے نازک موضوعات پر مناظرے اور مباحثے کیے۔ جامعہ الازہر قاہرہ بھی گئے اور نامور علماء سے بحث و مباحثہ کیا ۔ مولانا جب عالمگیر دورہ سے واپس آئے ، تو وہ بہت شادمان تھے۔ وہ سب کو شکست دے کر آئے تھے اور جو شکوک اپنے ساتھ لائے ، ان پر کئی دن تک مسلسل اپنے سب سے قریبی ساتھی اور رفیق مولانا غلام یحیٰی صاحب سے، جو ان کے بعد جامعہ الٰہیات کانپور کے شیخ تھے پوری وضاحت سے بحث کرتے رہے ۔ افسوس کہ ان دونوں نے مل کر فلسفے اور الٰہیات کے جو دُر بے بہا جمع کیے وہ ایک قیمتی خزانے کی طرح زیر زمین مدفون ہوگئے[۱۱]۔ مولانا آزاد سبحانی تعلیم سے فارغ ہو کر ادبی اور علمی کاموں میں مصروف ہوگئے ۔ یہ وہ دور تھا جب مسیحی پادری اور آریا سماجی مبلغ خلافِ اسلام تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے ۔ مارچ ۱۹۰۸ء

میں آریا سماجیوں نے بھرت پور کے نو مسلم راجپوتوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش کی ۔ اس کے ردِ عمل میں مسلمان علماء میدان عمل میں آ گئے ۔ تبلیغی انجمنیں بننے لگیں، تاہم ایک ایسے ادارے کی اہمیت اپنی جگہ تھی جو تبلیغ اسلام کے لیے مبلغین کی تربیت کرے ۔ چنانچہ مولانا آزاد نے ۱۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو مدرسہ الٰہیات کانپور کی بنیاد رکھی ۔ اس مدرسہ نے اسلام اور خلاف اسلام تحریکوں کو سمجھنے سمجھانے کی روایت ڈالی ۔ قید سے رہائی کے بعد مولانا کا جوش ایمانی کچھ اور بھی بڑھ چکا تھا ۔ چند دنوں کے اندر مولانا نے مشرقی یو پی اور بہار کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے[۱۲] مسلمانوں کو حالات حاضرہ سے آگاہ کیا اور ان کو مسلمانوں کے خلاف بین الاقوامی سازش سے روشناس کرتے ہوئے حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے مستعد ہو جانے کی تلقین کی[۱۳] ۔ غالباً ۱۹۱۸ء میں کلکتہ میں اخبار الدین ڈیلی نیوز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر حملہ کیا، جس پر مسلمانوں نے احتجاجی جلسے کیے، لیکن گورنمنٹ نے مسلمانوں کی داد رسی کے بجائے ان پر سختی کرنا شروع کر دی اور گولیاں برسائیں، جس سے سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے ۔ ان واقعات سے مسلمان نہایت برہم ہوئے ۔ مولانا آزاد سبحانی نے اس دوران مسلمانوں کی بھر پور ترجمانی کر کے مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی[۱۴] ۔

تقریر و خطبات

مولانا اپنی تقریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے ۔ دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے تھے ۔ سننے والوں کے دل جیت

تے تھے مگر وہ اپنی کسی تحریک کو پوری طرح منظم نہ کر سکے ۔
• بنیادی طور پر مفکر اور مقرر تھے ، منتظم نہ تھے ۔

مولانا آزاد کی خطابت کے بارے میں سید رئیس احمد جعفری مرحوم نے لکھا ہے کہ :

"(وہ) تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں ۔ تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں ۔ بہت بڑے فلسفی بھی ہیں ۔ تقریر میں فلسفیانہ تخیل و تجزی کے کمالات اور دلائلِ قاطعہ و براہینِ ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں . . . دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے، ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے ۔ جن کے خیالات گراں مایہ ہوتے ہیں وہ "بے زبان" ہوتے ہیں ، لیکن یہ شخص اقلیم خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستان زبان کا بھی تاجدار[۱۵]"۔

خواجہ جمیل احمد صاحب لکھتے ہیں :

"دوسرے دن نماز عشاء کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے ایک جلسہ سے خطاب کیا ۔ تقریر نیم سیاسی اور مذہبی تھی ۔ تقریر کیا تھی معلومات اور خطابت کا ایک دریا ابل رہا تھا، جو قلوب کو اپنی جانب بہائے لیے جا رہا تھا ۔ خطابت ، معلومات اور دلائل کا ایسا حسین امتزاج جیسا مولانا آزاد سبحانی کی تقریروں میں پایا جاتا تھا، میں نے کسی دوسرے شخص کی تقریر میں نہیں پایا"۔

مجھے تقاریر سننے کا شوق ہی نہیں خبط ہے ۔ تعلیمی زندگی کا

زیادہ حصہ الہ آباد میں گزرا ہے ، جو ہندوستان کا سب سے اہم سیاسی مرکز تھا ۔ کانگرس کا مستقر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اسلامی ہند کی سیاست کا بھی اہم ترین مرکز تھا ۔ پنڈت موتی لال نہرو نے جب سے اپنی شاندار کوٹھی "سوراج بھون" کانگرس کو نذر کر دی تھی، اس وقت سے اس کوٹھی میں آل انڈیا کانگرس کا صدر دفتر تھا۔ اسلامی ہند کی سیاست میں بھی الہ آباد کو اہم مقام حاصل ہے ۔ مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے سالانہ اجلاس میں جو اسی شہر میں منعقد ہوا تھا ، شاعر اسلام علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور ۱۹۴۲ء میں اسی شہر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائداعظم ، نواب بہادر یار جنگ اور رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے تصور پاکستان کو جلا بخشی تھی ۔

میں نے اس شہر الہ آباد میں گاندھی جی ، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال، سر سری نواس شاستری، پنڈت موہن مالویہ ، سوبھاش چندر بوس ، راج گوپال اچاریہ، ستیہ مورتی، بھولا بھائی ڈیسائی، سرتیج بہادر سپرو ، قائداعظم محمد علی جناح ، مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی ، نواب بہادر یار جنگ ، مولانا ابو الکلام آزاد ، ظفر علی خاں اور مولانا آزاد سبحانی ایسے عظیم مقرروں کی تقریریں سنیں ، لیکن جو جذبہ اور والہانہ پن مجھے آزاد سبحانی کی تقاریر میں ملا کسی دوسرے مقرر کے یہاں دستیاب نہ ہو سکا ۔ ان کی تقریروں کا دھیا، لیکن استدلالی انداز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سامعین کے قلوب میں اترتے

چلے جا رہے ہیں[۱۶] ۔

ان کے . . . . مقتدر اور مشہور عالم (معاصرین) بھی ان کے علم و فن اور خطابت کے قائل تھے[۱۷]۔

مولانا آزاد سبحانی نے حکومت کے خلاف اپنی سحر انگیز خطابت سے آگ لگا دی ۔ ایسا شوق شہادت پیش کیا کہ ہر شخص اسی جذبے سے سرشار نظر آنے لگا ۔ ان کی تقریروں میں جادو کا اثر تھا ۔ بڑے سے بڑا مجمع دم بخود ہوکر ان کی تقریر سنتا تھا ۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی بے پناہ خطابت کا اگر کامیابی کے ساتھ کوئی مقابلہ کر سکا تو وہ صرف آزاد سبحانی تھے ۔ جو لوگ ان کے افکار و نظریات کے بد ترین مخالف تھے اور ان پر تند و تلخ لہجے میں نکتہ چینی کیا کرتے تھے وہ بھی مولانا کے رنگ خطابت سے اتنے مسحور تھے کہ ان کی کوئی تقریر ناغہ نہیں کرتے تھے ۔ اس قسم کا ایک واقعہ مشہور مؤرخ سید رئیس احمد جعفری بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :

"ایک مرتبہ ، یہ میری طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررِ خصوصی مولانا آزاد سبحانی تھے۔ وہ آئے اور خطابت کے لعل و گوہر بکھیرنے لگے ۔ سارا مجمع دم بخود تھا ، عام بھی اور خواص بھی ۔ یہ نہرو رپورٹ کا زمانہ تھا ، مولانا اس کے مخالفین میں سے تھے اور "الناظر" کے مدیرِ شہیر مولانا ظفر الملک علوی اس کے ثناخوانوں میں تھے اور لوگوں پر بیدردی سے نکتہ چینی کر رہے تھے جو نہرو رپورٹ کے مخالف

تھے ۔ دورانِ تقریر کسی کام سے میں نے ہال سے قدم باہر نکالا تو دیکھتا کیا ہوں ، مولانا ظفرالملک علوی خلافِ معمول نہایت تیزی کے ساتھ سائیکل پر رواں دواں تشریف لا رہے تھے۔ میرے ان کے خوردانہ اور بزرگانہ تعلقات تھے، میں نے لپک کر استقبال کیا اور پوچھا :

"مولانا ! خیر تو ہے ، آپ تو جیسے ہوا پر اڑے چلے آ رہے ہیں"!

مولانا نے فرمایا :

"ہاں بھئی ! میں اس شخص کی تقریر کے لطف سے محرومی گوارا نہیں کر سکتا ۔ کیا تقریر شروع ہو گئی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا ، مولانا نے سائیکل مجھے تھمائی اور تیزی سے ہال میں داخل ہو گئے"۔

جناب جعفری مزید لکھتے ہیں کہ :

"یہی کیفیت میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے عہدِ طالب علمی میں دیکھی ۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان (سابق صدر بھارت) ، ڈاکٹر عابد حسین ، پروفیسر محمد مجیب اور دوسرے اساتذہ اور عائدِ شہر ہمہ تن متوجہ ہو کر فکری اختلافات کے باوجود بیخودی کے عالم میں ان کی تقریر سنتے تھے[۱۸۸] ۔

ایک بار مولانا جامعہ تشریف لائے ۔ میں انجمن اتحاد کا نائب صدر تھا ۔ بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ مولانا کو تقریر کی دعوت

دی جائے۔ میں ذاکر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے ۔ میں نے تقریر کی دعوت دی ۔ فلسفیانہ استغراق و تامّل کے بعد قبول فرما لی گئی ۔ طے پایا کہ رات کو تقریر فرمائیں گے ۔

محمد علی ہوسٹل میں تقریر کا انتظام ہوا ۔ حاضرین مولانا کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے کہ دفعتاً کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی مسلسل آوازیں آنا شروع ہوئیں ۔ نظر اٹھائی تو مولانا کھٹ پٹی پہنے ہوئے خراماں مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں ۔ گاڑھے کا ایک تہبند زیب بر، تہبند کا باقی حصہ رونق دوش و سر ، بال کم تر سیاہ زیادہ تر سفید ، لیکن سفیدی دودھ کی سفیدی نہ تھی ، اس پر خاکساری کا رنگ غالب تھا ۔ ہم میں سے بہتوں نے سمجھا ، مولانا کے لیے موزوں تر جگہ اسٹیج کے بجائے خانقاہ ہو سکتی تھی یا کسی مسجد کی کوٹھری ۔ شاید مولانا نے یہ بات بھانپ لی تھی ۔ مسکراتے ہوئے اٹھے اور تبسم کے ساتھ تقریر شروع فرمائی ۔ یہ بے موقع تبسم بھی ناگوار گزر رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ اس تبسم کا جواب قہقہہ سے دے دیں ۔

اب مولانا کی تقریر شروع ہو چکی تھی ۔ دھلے ہوئے فقرے ، موزوں اور مناسب الفاظ، چست اور معنی خیز جملے، صاف اور شیریں زبان ، واضح اور دل‌نشین بیان ۔ خیالات زبان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، زبان خیال بلند ، پرواز کی بلندیوں پر روپوش . . . . کیا خدا کی قدرت ہے ، صورت دیکھیے تو ہیچ میرز ، باتیں سنیئے تو معلوم

ہو شاعر نے یہ شعر ان ہی کے لیے کہا ہے :

مبین حقیر گدایانِ قوم را کیں قوم
شہانِ بے کر و خسروانِ بے کلہ اند[۱۹]

مولانا آزاد سبحانی اور مولانا ابوالکلام آزاد

قیام پاکستان سے قبل ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال میں مولانا آزاد سبحانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تقریری مقابلہ ہوا ۔ دونوں ہندوستان کے چوٹی کے مقرر تھے ۔ آزاد کی فصاحت و بلاغت اور پُرجوش تقریر کے مقابلہ میں آزاد سبحانی کی باوقار مؤثر اور مدلّل تقریر برابر کی جوڑ تھی ۔ سامعین مسحور ہوکر رہ گئے اور انھیں فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا کہ کس کی تقریر بہتر تھی اور کون بازی لے گیا ۔

کلکتہ میں عید کی نماز کی امامت مولانا ابوالکلا آزاد کیا کرتے تھے ۔ لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع مولانا آزاد کے پیچھے نماز ادا کرتا تھا ، لیکن جب پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا ، تو کلکتہ کے بیشتر مسلمانوں نے مولانا آزاد کی امامت میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا ۔ کیونکہ وہ ہندو کانگرس کے صدر اور پاکستان کے مخالفین میں سے تھے ۔ چنانچہ کلکتہ میں عید کے بڑے اجتماع کی امامت مولانا آزاد سبحانی نے کی[۲۰] ۔

مولانا سبحانی کے ہم تخلص ، مولانا ابوالکلام آزاد بھی فن تقریر میں اپنی مثال آپ تھے مگر ان کے کانگرس سے وابستہ ہونے

کے سبب مسلمانانِ کلکتہ نے ان کی اقتداء میں نمازِ عیدین پڑھنے سے انکار کر دیا، تو قرعہ فال مولانا آزاد سبحانی کے نام پڑا اور دو سال انھوں نے یہ فرائض انجام دیے۔

مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑا تو کلکتہ کے آزاد میدان کی نمازِ عیدین کی امامت اور خطابت سے مولانا ابوالکلام آزاد کو ہٹانے پر توجہ ہوئی، لیکن سوال یہ تھا کہ کون یہ جگہ پر کر سکے گا۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد مولانا آزاد سبحانی سے رجوع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ایک وفد نے لکھنؤ آ کر ان سے درخواست کی اور بڑی منت و سماجت کے بعد انھیں راضی کر لیا گیا۔ مولانا کلکتہ گئے اور نماز عیدالفطر کے موقع پر ایک معرکہ آراء خطبہ دیا، لیکن اس میں معترضین اور منتظمین کے خلافِ توقع مسلم لیگ کی کوئی حمایت اس لیے نہیں کی کہ وہ خطبۂ نماز کو مختلف سیاسی مسلکوں کے مسلمانوں میں وجہِ تفریق بنانے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے بعد جب عیدالاضحیٰ میں امامت کا سوال اٹھا، تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کسی کا نعم البدل نہیں ہوں"[۲۱]۔

میاں ظفیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

> مولانا آزاد سبحانی کو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں اس وقت دیکھا جب وہ کلکتہ میں عید کی عظیم الشان جماعت پڑھانے اور خطبہ دینے کے لیے آئے تھے۔ کلکتہ میں عیدین کے ان اجتماعات کی تاریخی حیثیت تھی۔ اس میں کئی لاکھ فرزندانِ توحید شریک ہوتے تھے۔ آزاد سبحانی سے پہلے عیدین کی امامت و خطابت مستقلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین فرماتے

تھے اور ان کے انتقال کے بعد قریب ۲۰ برس تک مستقل "امام الہند" مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ فرائض انجام دیے ۔

مولانا آزاد کلکتہ ہی میں رہتے تھے ، کلکتہ کے مسلمان برسہا برس سے ان کی تقریر و تحریر کے اثر میں تھے ، ایک سحر تھا جس سے کلکتہ کے لاکھوں مسلمان مسحور تھے اور کلکتہ کے مسلمانوں کو ابوالکلام آزاد کے اس سحر اور اثر سے باہر نکالنا کوئی معمولی کام نہ تھا ۔ یہ مولانا راغب احسن کی ذات تھی ، جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف وہ مؤثر اور بھرپور تحریک چلائی کہ "امام الہند" کو اس موروثی اور جدی امامت کے منصب سے سبکدوش ہونا پڑا ۔ پنجاب سے مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس تحریک میں مولانا راغب احسن کا پورا پورا ساتھ دیا تھا ۔

"مولانا حسن مثنٰی نے اپنے معروف ماہنامہ "مہر نیم روز" میں ایک بار لکھا تھا کہ کلکتہ میں علم و ادب اور سیاست کی دو بساطیں بچھی تھیں ، ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی دوسری بساط مولانا راغب احسن نے بچھا رکھی تھی ۔

غلام احمد پرویز نے اپنے ماہنامہ "طلوع اسلام" میں راغب احسن کے تذکرے میں لکھا تھا کہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے جتنا لٹریچر سارے ہندوستان کی مسلم لیگ نے مل کر پیش کیا تھا ، اس سے کہیں زیادہ لٹریچر اس جماعت اور تحریک کے لیے تن تنہا مولانا راغب احسن نے فراہم کیا تھا ۔ جن لوگوں نے کلکتہ کے مسلمانوں پر مولانا ابوالکلام کا اثر دیکھا ہے، وہی یہ جان سکتے ہیں کہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کو اس منصب اور منبر سے

سبکدوش نہیں کیا جاتا، تو بنگال میں تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا تھا ، جس کا مظاہرہ اس زمانہ میں چشمِ عالم نے دیکھا تھا ۔ مولانا آزاد کو اس مقام سے ہٹانے میں خود ان کی دو باتوں کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا ، اولاً یہ کہ مولانا آزاد نے اپنی مشہور تفسیر قرآن ترجمان القرآن میں یہ لکھا تھا کہ ذوالقرنین تاریخ کا مشہور ایرانی فرمانروا "سائرس دی گریٹ" تھا اور انھوں نے ترجمان القرآن میں پہلی بار یہ جدت بھی کی تھی کہ قرآن پاک کے اندر "سائرس دی گریٹ" کی تصویر بھی شائع کی تھی اور لکھا تھا کہ یہی ذوالقرنین تھے ۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ شہنشاہ ایران نے اپنے ڈھائی ہزار سالہ جشن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اسی تحقیق کی بنیاد پر اپنا رشتہ سائرس دی گریٹ سے جوڑا تھا ۔ دوسری بات جس نے کلکتہ کے مسلمانوں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس منصب سے علیحدہ کر دیں یہ ان کی وہ تقریر تھی جس میں مولانا آزاد نے دورانِ تقریر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ پچھلے ۲۱ برسوں سے وہ جو دعوت دیتے آ رہے ہیں وہ حق پر مبنی ہے اور عزیمت و صداقت کی دعوت دینے والوں کے انجام کے ضمن میں انھوں نے "گلیلیو" اور "امام احمد بن حنبل" کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ :

"اگر تم پر مکھیوں اور مچھروں کا گروہ ٹوٹ پڑے تو کیا تم ان کے خوف سے اپنے کپڑے اتار پھینکو گے"۔

مولانا آزاد کے اس ریمارک نے کلکتہ کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا اور ان محرکات نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مجبوراً

مولانا ابوالکلام آزاد کو اس جدی اور موروثی منصب امامت سے سبکدوش ہونا پڑا ۔ چنانچہ ان کی سبکدوشی کے بعد کلکتہ میں عیدین کی جماعت پڑھانے کے لیے سب سے پہلے مولانا آزاد سبحانی اور اس کے بعد مولانا جمال میاں فرنگی محلی بلائے گئے ۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی اس وقت بالکل نوجوان تھے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبوں کا عنوان " اقیم الصلٰوۃ و آتوالزکٰوۃ" ہوا کرتا تھا ۔ مولانا آزاد سبحانی کے خطبوں کا موضوع "حکومت الٰہی اور خلافت ربانی" ہوا کرتا تھا ۔ مولانا آزاد سبحانی عیدین کے علاوہ جب بھی تقریر کرتے تھے، ان کی تقریر اور تحریر کا بس یہی موضوع ہوا کرتا تھا"[۲۲]۔

حج اور شاہ عبدالعزیز بن سعود سے ملاقات

مولانا نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ایشیا اور یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا ، جس کی وجہ سے ان کے مشاہدات اور تجربات کو بہت استحکام ملا ۔ غالباً مولانا کا پہلا سفر ۱۹۳۶ء میں حجاز کا تھا ۔ اس سفر سے چند ماہ پیشتر مولانا ایسٹ انڈین ریلویز کے ملازمین کے حقوق کے مطالبہ کے سلسلہ میں کی گئی ایک تقریر کی پاداش میں لکھنؤ جیل میں قید کر دیے گئے تھے[۲۳] ۔ رہائی کے بعد مولانا براہ بمبئی ، تمام تر بے سر و سامانیوں کے ساتھ جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہنچے ۔ مکہ معظمہ میں پرانے رفیق داؤد غزنوی کے توسط سے شاہی مہمان بن گئے ۔ حج کے خاتمہ کے بعد مولانا غزنوی نے ہندوستانی زعماء کے اس وفد میں باصرار مولانا آزاد سبحانی

کو بھی شریک کر لیا جو شاہ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے جا رہا تھا ۔ شاہ عبدالعزیز بن شاہ سعود نے مولانا سے عرب عوام اور حکومت کے متعلق سوال کیا ۔ کوئی اور ہوتا تو تعریف کے پل باندھ دیتا ، یا مصلحت سے کام لے کر دو چار تعریفی جملے کہہ کر حقیقت حال چھپا جاتا ۔ لیکن مولانا کا مزاج ہی دوسرا تھا ۔ وہ حق بات ہر قیمت پر کہنے کے قائل تھے اور اسی انداز فکر نے انھیں تجویز "مکمل آزادی" کی ناکامی کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ سے منحرف کر دیا تھا ۔ چنانچہ مولانا نے بہت ادب لیکن صاف گوئی سے کہا :

"میں خود ایک غریب ملک سے تعلق رکھتا ہوں لیکن میں نے جو غربت کے مناظر مکہ اور مدینہ اور جدہ میں دیکھے ہیں وہ روح فرسا اور دل شکن ہیں"۔

مولانا نے مزید کہا :

" انگریزی اثرات کے توسط سے مغربی تہذیب کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے ، مذہب سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے حکومت کو فکر کرنی چاہیے کہ غریبی دور ہو اور مغربیت کا سدِّ باب ہو[۲۴]"۔

۱۹۳۵ء (ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ) میں آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی ، اس سال ہندوستان سے مندرجہ ذیل مشاہیر بھی حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے :

(۱) مولانا معین الدین اجمیری

(۲) مولانا عبدالقدیر بدایونی

(۳) مولانا حسرت موہانی

(۴) مولانا مظہر الدین ایڈیٹر "الامان" وغیرہ[۲۵]

مرد قلندر

خواجہ جمیل احمد لکھتے ہیں :

"مولانا آزاد سبحانی کو اس کے بعد متعدد بار مجھے دیکھنے ، ملنے اور سننے کا اتفاق ہوا ۔ فیض آباد سے درجنوں بار ان سے ملاقات ہوئی ۔ وہ بہت سادہ اور بے تکلف قسم کے بزرگ واقع ہوئے تھے اور اپنے اعزاز میں کسی قسم کے تکلف کو سخت ناپسند کرتے تھے ۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اسلامی ہند میں قرون اولی کے مسلمانوں کی قلندرانہ شان مولانا آزاد سبحانی اور مولانا حسرت موہانی ایسے بزرگوں کی ذات سے قائم تھی ۔ یہ دونوں بزرگ در حقیقت اقبال کے مرد قلندر کی زندہ تفسیر اور چلتی پھرتی تصویر تھے"[۲۶]۔

ماہنامہ روحانیت کے ذریعے خدمات

جنوری ۱۹۲۵ء میں مولانا سبحانی نے روحانیت (گورکھپور) کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا ۔ اس پرچہ پر تبصرہ کرتے ہوئے

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا :

"ہمارے دوست مولانا آزاد سبحانی ہر گوشہ سے تمتع اٹھا کر بالآخر ایسا معلوم ہوتا ہے اب گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر "وطن در انجمن" یا "سفر در حضر" کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں ۔ گو یہ قیاس بڑے یقین کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اب ان کی مستقل شاہراہِ زندگی ، مسلک تصوف کی ہوگی ۔ چنانچہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی بشارت یہ ہے کہ موصوف نے جنوری ۲۵ سے روحانیت کے نام سے ایک صوفیانہ رسالہ بڑی شان سے نکالنا شروع کیا ہے ، جس میں اپنے خاص انداز میں عقل و نقل ، علم و عمل ، حقائق قرآنی ، روح الاحادیث ، فلسفۂ امام ربانی ، تبصرات سبحانی ، مکتوبات سبحانی ، ملفوظات سبحانی ، اطلاعات سلسلہ وغیرہ کے عنوانات سے اپنے علمی اور روحانی فیوض کو وقف عام کیا ہے ۔ مولانا کی علمی لیاقت ، قابلیت ، حسنِ تقریر اور بعض دیگر خصوصیتوں کے ہم معترف ہیں ۔ ان کی خدمت میں مدت سے تعارف حاصل ہے اور اس لیے ہم دل سے ان کی کامیابی کے متمنی ہیں اور داعی ہیں کہ خدا ان کو توفیق دے کہ وہ استقلال کے ساتھ ملک و ملت کی ہدایت کا صحیح فرض انجام دیں ۔ رسالہ کی ضخامت دو جزو ہے" ۔

روحانیت ڈیڑھ دو سال سے زیادہ نہ چل سکا اور ایک دفعہ پھر مولانا آزاد سبحانی سیاست کے خار زار میں آ گئے ۔

حبِ رسول ؐ

مولانا آزاد سبحانی سیاست اور مذہب کو الگ نہیں تصور کرتے تھے ، یہی وجہ ہے کہ سیاسی امور میں بھی وہ محسنِ انسانیت ، حضورصلعم کی زندگی سے ہدایت لیتے تھے۔ چنانچہ اس انداز فکر سے آپ نے سرکار دو عالم کی زندگی ، معاملات اور شخصیت کو منطقیانہ اور فلسفیانہ نظر سے دیکھا ۔ رسول ؐ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے مطالعہ اور غور و فکر نے آزاد سبحانی کی بصیرت اور فکر میں غیر معمولی انقلاب برپا کر دیا تھا ۔ آپ رسول ؐ کے بے پناہ شیدائی تھے ۔ میاں ظفیر احمد کے الفاظ میں :

” . . . انھیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق و محبت تھی ۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کے اظہار میں عجیب عجیب نکتہ بیان کرتے کہ سننے والے وجد و کیف میں مبتلا ہو جاتے ۔“
. . . وہ کہا کرتے :

” . . . محمد ؐ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں ۔ وہ بشر کے اوپر ہیں ۔ الوہیت کے مظہر ہیں ۔ خدائی اپنی طاقت پوری طرح ان میں جھلکی . . . اگر وجود ہے تو وہ صرف محمد ؐ ہیں، قرآن میں ، منقبت یا حقیقت ۔ لیکن ایک بات خود قرآن کہتا ہے ۔ اس کتاب کی پوری حقیقت اس وقت تک نہیں کھلے گی جب تک کہ قیامت نہ آ جائے ۔ زمانہ گزرتا جائے گا اور حقیقت کھلتی جائے گی اور جب perfection of humanity کا وقت آ جائے گا تو اس وقت حقیقت محمدی کھل جائے گی“[۲]۔“

حواشی باب پنجم

۱ ۔ چند یادیں : ۱۱۲ ، ۱۱۷

۲ ۔ حادثہ مچھلی بازار کانپور کے لیے ملاحظہ ہو :
اعمال نامہ ۔ سر رضا علی
علی برادران ۔ سید رئیس احمد جعفری (لاہور : محمد علی اکیڈمی ۱۹۶۳ء) ، ص ۲۸-۲۰ ۳

۳ ۔ فرانس رابنسن ۔ حوالہ مذکور ، ص ۲۱۵ (حاشیہ)

۴ ۔ تقریر مولانا آزاد سبحانی ، بحوالہ

Home Department-Poll-(B) No, 70-74, Nov. 1913
National Archives, New Delhi.

اور

۵ - Home Department (B) poll-70-74 November 1913
National Archives New Delhi

۶ ۔ رسالہ حسرۃ الآفاق : ، ص ۱۷ - ۱۸

۷ ۔ ایضاً

۸ ۔ رسالہ حسرۃ الآفاق : ، ص ۱۸

۹ - *Separatism among Indian Muslim* pp. 278,306

۱۰ ۔ ایضاً ۔

۱۱ ۔ شب چراغ : ۱۲۰

۱۲ - Home poll (B)July1914, 124-B National Archives, New Delhi.

۱۳ ۔ تحقیقات : ۱۰۸

۱۴ - مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ، بدایوں ۱۹۴۰ء ، ص ۳۸۹ ، ۳۹۰ - سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ ، ۱۹۴۱ء ، ص : ۱۳۷ - شاہراہ پاکستان از چوہدری خلیق الزماں ، کراچی ۔

۱۵ - سید رئیس احمد جعفری - دید و شنید (لاہور : کتاب منزل ۱۹۴۸ء) ص ۵۸ ، ۶۰

۱۶ - چند یادیں : ۱۱۱

۱۷ - ایضاً

۱۸ - کاروان گم گشتہ از رئیس احمد جعفری ، کراچی ۱۹۵۱ء ، ص ۳۴۶

۱۹ - دید و شنید از رئیس احمد جعفری، لاہور ۱۹۴۸ء ، ص: ۵۸ تا ۶۰

۲۰ - چند یادیں : ۱۱۷

۲۱ - شب چراغ : ۱۲۱

۲۲ - جنگ اخبار : ۷

۲۳ - یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک میں غالباً کوئی اہم سیاسی شخص لیگ لیڈرنگ میں نہ تھا ۔

۲۴ - انٹرویو حسن سبحانی صاحب

۲۵ - معین النطق از مولانا معین الدین اجمیری ، کراچی ۱۹۶۷ء ، ص : ۹۶

۲۶ - چند یادیں : ۱۱۱

۲۷ - تحقیقات : ۱۱۳ ، ۱۱۴

باب ششم

مولانا آزاد سبحانی اور سوشلزم/کمیونزم

مولانا آزاد سبحانی نے مارکس کو بہت توجہ سے پڑھا تھا۔ آپ مارکس کی ذہنی صلاحیت، انقلابی نقطۂ نظر، سیاسی فکر اور پُر زور دلائل سے متأثر تھے۔ ایک زمانہ میں خود کو مارکسسٹ بھی کہا کرتے تھے[1]۔ لیکن ان کا مارکسزم بالکل دوسری بنیادوں پر قائم تھا[2]۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کے عظیم ترین انقلابی خود جناب محمد رسول اللہ تھے۔ آپ نے جن حالات میں انسانوں کو صلح و آشتی، محبت و یگانگت، وحدانیت کا درس دیا اور ان کو عملاً جہالت و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر چند برسوں میں دنیا کی مہذب ترین قوم بنا دیا وہ تاریخ کے صفحات میں آج بھی محفوظ ہے[3]۔ آزاد سبحانی مارکس کے مداح اور کمیونزم سے متأثر ہونے کے باوجود یہی کہا کرتے تھے کہ مارکس کے کمیونزم کا انحصار خدا کے انکار پر ہے جب کہ ان کے کمیونزم کی بنیاد خدا کے اقرار پر[4]۔ مولانا آزاد سبحانی اس طرز فکر کی وجہ سے بعض حلقوں میں کمیونسٹ مشہور ہو گئے، غالباً اس شہرت کے پسِ پشت کمیونسٹ نظریات پر

کاربند حضرات کی ان سے قربت بھی رہی ہے جو اکثر مولانا سے ملاقات اور سیاسی گفتگو کے لیے تشریف لایا کرتے تھے[۵]۔ باوجود کمیونسٹ حضرات سے قربت اور ابتدا میں کمیونسٹ تحریک سے متأثر ہونے کے مولانا آزاد سبحانی کبھی پارٹی کے ممبر نہیں بنے[۶]۔

مولانا آزاد سبحانی کے صاحبزادے حسن سبحانی صاحب کہتے ہیں :

"تقسیم ہند اور اس کے اثرات کے نتیجہ میں مولانا آزاد سبحانی کے سیاسی نظریات میں بہت تبدیلی آ چکی تھی - وہ ۱۹۲۴ء تک قومی سیاست میں جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ سیاست کے حامی اور علمبردار تھے۔ اب ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت ایک غیر سیکولر حکومت ہے[۷]۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی اساس پر قائم رہتے ہوئے ، کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے[۸]، کیونکہ ہندوستان کی آزادی عارضی ہے اور ملک جلد ہی کمیونسٹوں کے حملہ کی زد میں آ کر مغلوب ہو جائے گا[۹]۔"

مولانا مذہبیت کے باوجود اشتراکیت سے بھی متأثر تھے اور انتقال سے قبل سیاحتِ روس بھی کر آئے تھے ۔ سیاسی رنگ میں دو رسالے "آزادی مالا بار اور موپلا" لکھے تھے اور روحانیت و مذہب پر بھی وہ کتابیں تحریر کی تھیں جو اب معدوم ہیں ۔

علامہ سبحانی ، گاندھی جی کے ساتھ بھی کچھ عرصے رہے مگر بعد میں فلسفہٴ عدم تشدّد کو بے جان سمجھ کو چھوڑ دیا اور

انسانیت کی نجات کے لیے تحریک خلافتِ ربّانی کی بنیاد رکھی، جو سوشلزم کی تعلیمات کو کلمہ پڑھا کر پیش کرنے کا نام تھا ، دوسرے لفظوں میں وہ حضرت ابو ذر غفاری کے مسلک کی اشاعت کر رہے تھے ، جن کو یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ وہ کھانا کھا چکے یا نہیں ، سو چکے ہیں یا ابھی سونا باقی ہے -

---

حواشی باب ششم

۱ - Tara Chand, *History of the Freedom Movement*... Vol III p.498

۲ - انٹرویو حسن سبحانی صاحب

۳ - یہ بھی ایک اعجوبہ ہی ہے کہ کوئی عالم دین مارکس کے فلسفہ سے اس قدر متأثر بلکہ مرعوب ہو کہ خود کو مارکسسٹ کہنے لگے اور اسلام اور کمیونزم میں ایسے کسی تضاد کا احساس تک نہ ہو -

۴ - یہ بنیادیں کیا تھیں ؟ اگر یہ خالص اسلامی تھیں تو انھیں مارکسزم کیوں کہا جائے ؟ اگر یہ اسلام اور غیر اسلام کا آمیزہ تھیں تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام شرک کو گوارہ نہیں کرتا - وہ تنہا اپنی حکمرانی چاہتا ہے (مدیر) -

۵ - یہ دلیل دلیا پر چھائے ہوئے ہر باطل فلسفہ کو اسلام سے جوڑنے کے لیے بآسانی دی جا سکتی ہے (مدیر) -

۶ - بحوالہ مقالہ میاں ظفیر احمد — اللہ رحم کرے بہت سے اور بزرگوں نے بھی اس طرح کی باتیں کہی ہیں اور الھی نکتہ طرازیوں سے شریعت کے بالمقابل طریقت کے نام سے ایک پورا فلسفہ کھڑا کر دیا ہے (مدیر) -

۷ - بحوالہ مقالہ میاں ظفیر احمد — دنیا حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسلام اسی کائنات اور انسان کی حقیقت ٹھیک ٹھیک بیان کرتا ہے - مسلمانوں کے زوال کا سبب اسی حقیقت سے انحراف ہے - اس کا کوئی دوسرا سبب نہیں ہے (مدیر) -

۸ - انٹرویو حسن سبحانی صاحب

۹ - یہی لمحہ تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے - مسلمان اپنی اساس پر قائم رہتے ہوئے کس طرح کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو سکتے ہیں - مسلمان کے دین کی اساس کتاب و سنت پر ہے - کیا روس ، چین اور خود ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی میں جو مسلمان ممبر ہیں وہ اپنی اس اساس ، پر قائم ہیں ؟ جب تک آپ اپنی اساس کو چھوڑ نہیں دیتے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں بن سکتے (مدیر) -

۱۰ - انٹرویو حسن سبحانی صاحب

۱۱ - شب چراغ : ۱۱۲

ساتواں باب

سفر نامۂ ربّانی کے اقتباسات

مولانا آزاد سبحانی کے صاحبزادے حسن سبحانی نے ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں لکھنؤ سے مولانا آزاد سبحانی کا سفر نامہ شائع کیا۔ یہاں ہم اس کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو قارئین کے لیے یقیناً مفید ہوں گے۔

سیاحت کا زمانہ

میری یہ سیاحت ۱۹۳۵ء اور ۱۳۵۵ محمدی ہجری میں اپنے کو شروع کر سکی اور ۱۹۳۶ء و ۱۳۵۶ھ میں خاتمہ پر آئی، لوٹتے میں مصر دوبارہ زیر پا اور تحت گشت آیا، اس لیے اس سیاحت کو مخلوط سیاحت بھی کہہ سکتے ہیں جس میں مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق بھی تھوڑا سا شریک ہو گیا ہے، اس بار مصر میں ٹھہرنے کی مدت قریب قریب ایک مہینے کے رہی۔

(سفر نامۂ ربّانی، ص: ۳۰)

میری اس سیاحت کا زمانہ وہ تھا جو مسلم لیگ اور کانگرس کے انتخابی مقابلے کا زمانہ تھا، میں بھی اس مقابلہ میں اپنے مزاج

اور اپنے اصول کے مطابق مسلم لیگ کی حمایت کے واسطے اٹھ کھڑا ہوا تھا ۔ میں نے کانگرس ، جمعیۃ العلماء ہند کے مقابلہ کے لیے جمعیۃ العلماء اسلام بنا کر کھڑی کر دی تھی اور اس کے سہارے مسلم لیگ کو مضبوط کر رہا تھا ۔

(سفر نامۂ ربانی : ۱۵)

سفرِ یورپ کی زادِ راہ

اچھا لیجیے ! اب اپنے زادِ راہِ مغرب کے بھید کی کنجی، دنیا کے سامنے ڈالے ہی دیتا ہوں ، میرے زاد راہ مغرب کا انتظام میرے صرف چار دوستوں نے کیا تھا اور ان میں سے سب سے قیمتی امداد میرے گرم جوش دوست ابوالقاسم بردوانی نے کی تھی جو ابھی تک زندہ ہیں اور ڈھاکہ میں رہتے ہیں ، ان کے بعد دو دوسرے دوستوں کی مدد کا درجہ تھا ۔ اور وہ دونوں آہ کہ مر گئے ۔ چوتھے صاحب جن کی مدد بالکل آخری درجہ کی تھی کلکتہ کے ایک چرمی سوداگر تھے، یہ زندہ ہیں، لیکن یہ بھی سن لیجیے کہ میری زاد راہ اتنی حقیر تھی کہ مجھ مجنوں یا مجذوب کے سوا کوئی سالک اور عقلمند الٹے پر اس نازک سیاحت کو سوچنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا ۔ یہاں تک کہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ میری زاد راہ صرف توکل اور اولوالعزمانہ صبر کی گٹھری تھی تو ذرا بھی تردد نہیں کرنا چاہیے، اس حقیقت پر ایمان بالغیب لانے میں ۔

اب میں اپنے مقصدِ سیاحت کو بھی پوری صفائی سے جتا دینا چاہتا ہوں ۔ مشہور یہ ہے کہ میں یورپ و امریکہ ، پاکستان کے

پروپگنڈے کے لیے گیا تھا، لیکن یہ بات اتنی ہی غلط ہے جتنی کہ یہ بات کہ حضرت خضر دنیا بھر میں اس لیے گھوم رہے ہیں کہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ ہضم ہو جایا کرے ۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اس کام سے کہیں بڑے کام کے لیے نکلا تھا ، بڑا کام کیا تھا ؟ علم کی تکمیل ۔

(سفر نامۂ ربانی : ۲۰-۲۱)

علم کی تکمیل کا مطلب

علم کی تکمیل کا یہاں کیا مطلب ؟ یہاں یہ مطلب کہ میں یورپ و امریکہ کے فلسفیوں سے مل کر اپنے مخصوص فلسفۂ ربانیہ کو جانچوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور اگر اس میں کچھ کسر نکلے تو اس کو مکمل کر ڈالوں ۔

(سفر نامۂ ربانی : ۲۱-۲۲)

عالمی نظامِ حکومت کا قیام

کیونکہ میں اس کام کو پاکستان قائم کرنے کے کام سے بھی بڑا کام کہتا ہوں ، دران حالیکہ میں پاکستان کے بنیادی بانیوں میں سے ہونے کے جرم کا مجرم ہوں ، اس وجہ سے کہتا ہوں کہ پاکستان میری نگاہ میں صرف ایک سیڑھی اور صرف پہلی سیڑھی تھی اس عالمی نظامِ حکومت کی جو عالمی انسانی بھلائی اور عالمی اسلامی فلاح کا مکمل ذریعہ ہے ۔ چنانچہ پاکستان کی بنیاد ثابت بھی ہوئی ۔ سیڑھی اور پہلی ہی سیڑھی ۔

تب پاکستان قائم کرنے کا سودا صرف ایک چھوٹا سا کام تھا۔ بڑا کام تو اس عالمی نظام حکومت قائم کرنے کا عمل ہے جس سے عالمی انسانی بھلائی اور عالمی اسلامی فلاح بندھی ہوئی ہے اور یہ عمل جیسا کہ خود بڑا ہے بڑے علم کو بھی ڈھونڈھتا ہے۔ تب اس بڑے علم کو کمانا بھی جو اس بڑے عمل کے لیے درکار ہے، بڑا کام ہے اور چونکہ میں خود بھی اس بڑے عمل کو کرنا چاہتا اس لیے میرے لیے بھی اس بڑے علم کی کمائی بڑا کام تھا اتنا بڑا کام کہ پاکستان کی بنیاد کا کام، اس کے مقابلہ میں چھوٹا کام تھا اور بہت چھوٹا کام۔ پھر جب کہ میں پاکستان کی بنیاد اندازی کے چھوٹے کام کو اپنی حیثیت اور طاقت کے اندر ختم کر چکا تھا یعنی یہ کہ پاکستان کے مسئلے پر مسلم لیگ کی انتخابی جیت کا انتظام جمعیۃ العلماء اسلام قائم کرکے کر چکا تھا تب میں بالکل فرصت پا چکا تھا کہ اپنے بڑے کام کو بغیر دیر کیے شروع کر دوں۔

(سفر نامۂ ربّانی : ۲۲-۲۳)

سیاحت کا میدانِ جولانی

میری اس سیاحت کا میدانِ جولانی صرف مزدوروں، ادنٰی متوسّطوں کا طبقہ تھا۔ میں اس میدان سے آگے جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور جا بھی نہیں سکتا تھا۔ آگے کی اڑان کے لیے دولت اور وجاہت کے بازو ضروری ہیں، میں ان بازووں کے حساب سے بےبازووں کا تھا لیکن یقین کیجیے کہ میں اس محرومی پر کڑھا نہیں۔ کڑھتا تو جب کہ جس چیز سے محروم تھا اس کی ہوس ہوتی۔ میری زندگی اور میری فطرت ایسی ہوسوں میں شکر ہے کہ شروع ہی سے نہیں پھنسی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سرمایہ داروں یا علماء کے طبقے سے نفرت کرتا ہوں ۔ شکر ہے کہ میں نے ایسا تنگ دلانہ اور وحشت منادانہ مزاج نہیں پایا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ان بزرگوں سے ملنے کا شوق نہیں رکھتا نہ اس کارِ خیر کے لیے کوئی تکلیف اٹھانا چاہتا ، البتہ : مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟
(سفرنامۂ ربّانی : ۴۷)

سرمایہ پرستی

میری اس سیاحت نے محنت اور دولت کے جمع کے عقیدے کو بھی سکھایا ۔ میں پہلے صرف محنت کا قائل تھا ، دولت کا نہیں ، اس سیاحت نے مجھ پر یہ کھولا کہ محنت صرف ایک بازو ہے ، دوسرا بازو دولت، ایک بازو اڑنے کو کافی نہیں ۔ دوسرا بازو بھی ضروری، تب محنت پر اتنا گھمنڈ نہ ہو کہ دولت سے بے پروائی آ جائے ۔

میرے بعض وہ کام جو اکیلی دولت کے کام تھے ، اکیلی محنت سے یا تو ہو بھی نہ سکے یا ہوئے تو دیر لگی اور کلفت اٹھانی پڑی ، اس وقت قدرتاً یہ حسرت اٹھی کہ کاش دولت بھی میری ایک خدمت گزار ہوتی ۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ میں نے سرمایہ دار بننے کی حسرت کی ۔ ہرگز ہرگز نہیں ، معاذ اللہ ، بلکہ یہ مطلب لیا جائے کہ ضرورت کے وقت ضرورت کے لائق ہو بھی ہوتی تو اچھا ہوتا ۔

میری اس سیاحت نے میرے عقیدۂ ربّانیت کو بھی پوری شہ دی ۔ میں نے دیکھا کہ سرمایہ پرستی اور غریبی کے مغرب میں بھی اتنے ہی دالت اور گوشت ہیں ، جتنے مشرق میں ۔ غریبی مغرب کی

بھی اتنی ہی خون خوار اور خون آشام ہے جتنی مشرق میں - پھر دونوں کی لڑائیاں یہاں بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی مشرق میں -

پھر یہاں بھی میرے دماغ نے مجھ سے یہی کہا کہ جب تک سرمایہ پرستی کی زہریلی گھاس چھیل کر پھینک نہ دی جائے گی ، انسانی زندگی کی کھیتی لہلہانے نہ پائے گی ، سرمایہ پرستی کے نقوش جب تک انسانی جمعیت کی تختی پر ابھرے رہیں گے ، عافیتِ عامہ کے نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے - پھر یہاں بھی میرے دل نے پکارا کہ یا تو ربانی انقلاب ضروری ہے یا پھر زمین پر انسانی جہنمیت مستقل اور دائمی -

(سفر نامۂ ربانی : ۵۴-۵۵)

عقیدۂ ترقی

میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ چاہے مشرق ترقی کرے چاہے مغرب ، ہر ایک کی ترقی انسانیت کی ترقی ہے ، البتہ کسی کی ترقی ایسی نہ ہونی چاہیے جو دوسرے کو تنزّل دے - جب یہ عقیدہ ہے تب مغرب کی ترقی کو ہمیشہ خوش آمدید کہہ سکیں گے - البتہ اس ترقی کو نہیں جو مشرق کی تباہی کی لیت سے اٹھی ہو -

مغرب کے مفکرین کا شوق باطنیت

میری اس سیاحت نے مجھے خبر دی کہ یورپ و امریکہ کے مفکّروں اور فلسفی منش عالموں میں باطنیت کا شوق بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے - اب یہ لوگ باطنیوں کو بھی ڈھونڈھتے پھر رہے ہیں اور باطنیت کی ساری ریاضتوں کو جھیل جانے پر کمر باندھے ہوئے

ہیں ۔ البتہ یہ بات ہے کہ یہ شوق موجودہ تنزّل میں عشق کا پھل نہیں ہے عقل اور فقط عقل کا پھل ہے جس میں عشق کی چاشنی تک نہیں ملی ہوئی ہے لیکن یہ بات بری بھی نہیں ہے بلکہ اچھی ہی ہے، عشق کا اٹھایا ہوا شوق اکثر جنون بن جاتا ہے ، جنون ہلاکت کی آخری سیڑھی ہے ، ہلاکت وہ خندق ہے جس میں اترنے پر کوئی خوش نصیب تیار نہیں ۔ (سفر نامہ رہبانی : ٦٣)

سیاحت کے اعمال اور حاصلات

خلاصۃ الباب کے طور پر اس سیاحت کے اعمال اور حاصلات کی اصولی فہرست یہ ہے کہ :

(الف) حالات کے فلسفیانہ مشاہدے کی کوشش کی گئی اور اس سے تجربات اور معلومات کا استنباط عمل میں لایا گیا ۔

(ب) اعلیٰ علما و فضلا سے ملاقاتیں کی گئیں اور ان سے چند مقرر مسئلوں پر مذاکرات و مباحثات کیے گئے ۔

(ج) مشرق اور مغرب کے درمیان جو بنیادی اور جوہری امتیازی فرق ہیں ان کو دریافت کیا گیا اور ان کے توسط سے ابہام اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس سوال کو روشنی میں لایا گیا کہ کیوں مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ۔

د) مغرب میں فلسفہ کی جو اہمیت ہے اس کو معلوم کیا گیا اور ان کے فلسفہ کو ان کی زندگی سے ان کے تمدن

ہے اور ان کے دوسرے علوم و فنون سے جو رشتہ فعل و انفعال کا حاصل ہے اس کو دریافت کیا گیا ۔

(ہ) یہ معلوم کیا گیا کہ فلسفہ مغرب اور فلسفہ ربانیت کے درمیان کیا فرق ہے اور کس کو امتیاز حاصل ہے ؟

(و) فلسفہ مغرب نے دین اور تہذیبِ مغرب پر جو اثر ڈالا ہے اس کی کیفیت معلوم کی گئی ۔

(ز) تہذیبِ مغرب کی خصوصیات کا دقیق مشاہدہ کیا گیا اور اس کی فلسفیانہ تعلیل کی گئی ۔

(ح) مغرب کے مذہبی اور تہذیبی حالات کا عمیق مشاہدہ کیا گیا اور مشرق کے تہذیبی اور مذہبی حالات کا اس سے موازنہ کیا گیا ۔

(ط) فلسفہ ربانی کو علماءِ مغرب پر پیش کیا گیا اس غرض سے کہ وہ اس کی معقولیت اور اہلیت کا اندازہ کر لیں پھر عوام کو بھی اس سے آگاہ کیا گیا ۔

(ی) تصنیف و تالیف کا بھی تھوڑا سا کام انجام دیا گیا ، چند رسالے لکھے گئے انگریزی زبان میں تاکہ انگریزی خلقت بھی فلسفہ ربانی کے خیالات سے آگاہ ہو سکے ۔ ایک ایک انگریزی رسالہ تو چھپ بھی گیا جس کی اشاعت امریکہ میں جاری ہوئی ۔ یہاں کی تمام تصنیفات کا موضوع فلسفہ ربانی رہا ہے، گونا گوں اور مختلف اضافتوں اور نسبتوں

کے ساتھ مثلاً فلسفۂ ربّانی بابت شریعت، فلسفۂ ربّانی بابت سیاست ، فلسفۂ ربّانی بابت روحانیت ۔

(ک) فلسفۂ ربّانیت کے درس دیے گئے ۔ املائی اور خطابی دونوں شکلوں میں ، کتنوں نے درس لکھے اور ایک ذخیرہ تیار کر لیا ، اس طرح تقریباً سیکڑوں کی تعداد میں فلسفۂ ربّانی کے املائی شاگرد پیدا ہوگئے۔ فلسفۂ ربّانی پر تقریریں کی گئیں ۔ جو عموماً خصوصی طالبین کی طرف سے لکھی جاتی تھیں ، ان تقریروں نے شاگرد تیار کر دیے ۔ فلسفہ ربانی کے سلسلۂ بیان میں دین اور تمدّن کی ربّانی حقیقتوں پر بھی تقریریں کی گئیں ۔ اسی سلسلہ میں فلسفۂ ربّانی کی روشنی میں تقابلِ ادیان اور اخوت بین الادیان کے موضوع پر بھی تقریریں کی گئیں ۔

(ل) تحریکِ ربّانیت کو مستحکم اور متشکل کرنے کی کوشش بھی کی گئی اور اس سلسلے میں ذیل کی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں، ربّانیوں کی باضابطہ جماعت قائم کی گئی ، حزب الربّانین یا ربانی ایسوسی ایشن کے نام سے ایک مرکزی ربّانی انجمن قائم کی گئی۔ ربّانی قرطاسِ عضویت چھپوایا گیا اور ربّانی جماعت اور برادری میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے قرطاسِ عضویت پر دستخط لینے کی کارروائی جاری کی گئی ، خلافتِ ربّانی کے مقصد و نصب العین کو زبان زد اور دل نشین بنانے کے لیے محسن خلیفۃ اللہ اور ربّانیوں کی تعلیم جاری کی گئی جس

کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے کارلدے اور منتظم ہیں
اور ہم پرورش کنندہ ہیں ، غارت کنندہ نہیں ہیں -

(م) دعوتِ اسلام کا کام بھی ضمناً ہوتا رہا اگرچہ اصالتاً
کوئی کام امر کے متعلق نہیں کیا گیا ، نظم آرائی کا بھی
مشغلہ رہا ، رباعی لظمیں مرتّب کی گئی ، جس میں
سو (۱۰۰) رباعیاں فلسفۂ خودی پر اور گیارہ لمبے قطعے
مسئلۂ تہذیبِ مغرب و مشرق پر خاصتاً قابلِ ذکر ہیں -
یہ نظمیں بھی انشاء اللہ چھپیں گیں اور شائع کی جائیں
گی - یہ ایسی نظمیں ہیں کہ جن سے نئی شاعری میں شاید
ایک نئے انقلاب کی طرح اندازی ہو سکتی ہے -

(ن) ریڈیو والی بھی چند تقریریں کی گئیں - یہ سلسلۂ اعمال
کی صرف کلّیاتی فہرست ہے ؛ جزیاتی فہرست بہت لمبی
ہے اس کے لیے مقدمے میں گنجائش نہیں -

اب سلسلۂ نتائج کی کلیاتی فہرست کی باری ہے :

(۱) مذکورہ بالا علمی کوششوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کو
مشرق ذہانت کا ایک تازہ اعتراف کرنا پڑا اور یہ ماننا پڑا کہ
اگرچہ فلسفۂ عملی یعنی سائنس میں مغرب کی بلند مرتبگی
تصور و خیال سے بھی اونچی ہو گئی ہے - لیکن فلسفۂ
نظری میں جو فلسفے کی دوسری شاخ ہے ، مشرق مغرب
سے زیادہ پیچھے نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ برابر ہو
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ آگے ہو، فلسفۂ ربّانی

جس کو مشرق کا فلسفہ بھی کہہ سکتے ہیں ، کیونکہ میں مشرق ہوں ، الحمد للہ اتنا اونچا فلسفہ ہے کہ مغرب اس کے جواب میں صرف ایک فلسفہ پیش کر سکتا ہے اور وہ فلسفۂ اشتراکیت ہے، لیکن میرا اپنا اعتقاد یہ ہے کہ فلسفۂ ربّانی فلسفۂ اشتراکیت سے بھی اونچا ہے ۔ اگرچہ فلسفۂ اشتراکیت بھی فلسفۂ ربّانی کی طرح فلسفۂ ربوبیت ہی ہے، لیکن اس کا فلسفۂ ربوبیت فلسفۂ بلا ربّیت ہے یعنی جس کی بنیاد تک میں حضرت رب العالمین کی ہستی کا تصور کسی عنوان شریک نہیں ہے اور جس کی تشریحات اور تفصیلات میں تو اس تصور کی نفی تک موجود ہے اور یہ بات عرفان و ایمان کے معیار سے ایک پستی کی بات ہے اور کتنی بڑی پستی کی بات ؟ اس کے برعکس فلسفۂ ربّانیت فلسفۂ ربوبیت بالربّیت ہے ۔ یعنی وہ ایسا فلسفہ ہے جس کی اساسیات اور تفصیلات دونوں ہی میں تصوّر ہی نہیں عقیدہ بھی حضرت رب العالمین کی ہستی کا مضمر ہے ۔ اس خوبی نے فلسفۂ ربّانی کو فلسفۂ اشتراکیت سے قدرتاً بلند بنا دیا ہے ۔ اگرچہ یہ بلندی اشتراکین کے یہاں مسلم چیز تو نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو ہستیِ ربّی کو وہم کا اختراع مانتے ہیں ، تب اس کا اعتقاد ان کی نظر میں بلندی و برتری کا معیار کیسے بن سکتا ہے ؟ لیکن یہ بلندی کم سے کم اربابِ اعتقاد اور اہلِ دین کے یہاں تو مسلّم چیز ہے اور میرا تو دعویٰ ہے کہ اہلِ حقیقت کے یہاں بھی مسلّم چیز ہو سکتی ہے، دوسرے یہ کہ فلسفۂ اشتراکیت عالمگیر فطری قانون ربوبیت پر اپنی عمارت کو استوار نہیں کرتا بلکہ خود

اختراعی نظریے پر مبنی کرتا ہے ۔ یہ ایک دوسری بلندی ہے جو فلسفہ ربانی کو فلسفہ اشتراکیت کے مقابل میں حاصل ہے ۔

(۲) چونکہ فلسفہ ربانی کو اسلام سے ماخوذ بتایا گیا اس لیے مغرب میں اسلام کی عظمت کا بھی ایک نیا احساس شروع ہوا۔ اب تک یہ بدگمانی تھی کہ اسلام ایک سیدھا سادھا عامیانہ اور عوامیانہ مذہب ہے جو فلسفہ سے یکسر خالی ہے اور اس لیے وہ کتنا ہی متین الاصول اور صحیح المسائل مذہب ہو لیکن فلسفہ سے عاری ہونے کے سبب خواص کے قابل نہیں اور فلاسفہ کے لیے تو قابل التفات بھی نہیں ہے ، فلسفہ ربانی کی دعوت و تبلیغ نے اسی بدگمانی کو چھیلنا شروع کر دیا ہے ۔ اب ایک گروہ یہ اعتقاد کرنے لگا ہے کہ اسلام جہاں سیدھا سادھا مذہب ہے وہیں فلسفیانہ مذہب بھی ہے اور ایسا فلسفیانہ مذہب جس کا فلسفہ اپنا فلسفہ ہو پھر ایسا فلسفیانہ مذہب جس کا اپنا فلسفہ تمام فلسفوں سے اونچا ہو اور اس لیے اسلام خواص کے لیے ایسا لائق کہ وہ انھیں عوام سے بھی زیادہ مسخر کر سکتا ہے اور اشاروں پر انھیں نچا سکتا ہے ۔

(۳) دعوت ربانی نے مغرب کی نامانوس فضا میں جو اتنی ہر ہے کہ بنی ہوئی جگہیں بھی وہاں سے غائب ہو جاتی ہیں ، اپنی جگہ بنا لی ہے اور اس جگہ کو وہ استحکام دے دیا ہے کہ پہاڑ کی طرح اس کا بھی ٹلنا آسان نہیں رہ گیا ۔ پھر اس جگہ میں توسیع کی نا محدود گنجائش بھی ہے جتنا عمل بڑھتا جائے گا یہ وسعت بھی بڑھتی جائے گی ۔

(۴) اس دعوتِ ربّانی کے ضمن میں اسلام بھی از سر نو قابل توجہ بن گیا ہے یا یہ حال تھا کہ اسلام کو التفات کا بھی مستحق نہیں سمجھتے تھے یا یہ حال ہوا کہ اسلام پر غور و فکر شروع ہو گیا اور اس سلسلہ میں مطالعۂ قرآن کا شوق اس قدر بڑھ چلا تھا کہ مجھ کو مترجمِ قرآن کی مانگ پورا کرنا دشوار ہو گیا تھا ۔

(۵) غیر مسلموں کے اس گروہ میں جو اپنے مذہب کی طرف سے مطمئن نہیں ہے ساتھ ہی ساتھ مذہب کا احساس بھی رکھتا ہے ، با ضابطہ قبول اسلام کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور اس سلسلے کے مستقل اور کافی تیز ہو جانے کی بھی امید ہے اگر دعوتِ ربّانی کا کام بدستور جاری رہ سکا ۔

(۶) غیر مسلموں میں دعوتِ ربّانی کی یہ براہ راست تحریک "مودّت بین الادیان" نے اپنی صراحتی تاثیر بھی بخوبی راسخ کی جنھوں نے قبولِ اسلام کی سعادت نہیں کمائی ، کم سے کم اس طرف ضرور مائل ہو گئے کہ اسلام سے روا داری اور کشادہ قلبی کا برتاؤ کریں اور اسلام کو منصفانہ سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کریں ، پھر اسلام اور عیسائیت کی آپس کی مصنوعی رقابت و منافرت کو ختم کر دیں ۔ اس میلان کے اثر سے انھوں نے پہلا عملی قدم بھی ارتباط بالمسلمین کی طرف اٹھایا اور اس بے کالکت کو عملاً ختم کر دینے کی جرأت کی جو مدتوں سے مغربی دنیا میں مسیحی نظامِ مذہبی اور بہ لفظ دیگر چرچ

ارگنایزیشن کے ہاتھوں چل رہی تھی ، انھوں نے ساتھ ہی ساتھ مطالعۂ قرآن کا مشغلہ بھی شروع کر دیا ۔

(۷) ایک طاقتور جماعت ربّانی دواعیٔن اسلام و رہالیّت وجود میں آ گئی جس نے عملی کام جاری کر دیا اور جس کے عملی کام کے نتیجے رونما ہونے لگے، یہی جماعت ہے جس نے وہ سب کیا تھا جس کو میری سیاحت کا عملی کارنامہ کہا جا سکتا ہے ۔ یہی جماعت میری وقت عاملہ کے لیےواحد آلہ کار ثابت ہوئی جس سے میری امیدوں کا مستقبل بھی بندھا ہوا ہے ۔ لیکن یہ جماعت آسانی سے نہیں بن گئی ۔ مشکلوں سے بنی اور امتحانوں سے بنی، اسی لیے وہ اتنی پختہ کار بھی نکلی کہ اس پر غیبت میں بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ (سفر نامۂ ربّانی: ۸۳-۹۰)

سیاحت سے کیا کیا سبق سیکھے

جو جو سبق سیکھے ان میں سے صرف چند یہ ہیں ۔

(۱) اس زمانہ میں صرف دو قسم کے لوگ کامیاب سیاحت کر سکتے ہیں ، بڑے دولت مند اور محنت پیشہ مزدور ، تیسرے کو سیاحت کی درد سری نہیں اٹھانی چاہیے ۔ میں مزدور تھا ، اسی لیے میں بھی سخت مفلسی کے باوجود کامیاب سیاحت کر سکا ۔ پھر ایک میں کیا جتنے بھی مزدور سیاحت کو نکلے وہ کامیاب رہے ، لندن اور نیو یارک بھرے پڑے ہیں، ان مزدوروں اور سیاحوں سے جو ہندوستان اور پاکستانی ملکوں سے جہازوں پر خلاصی کا کام کرتے ہوئے لنگوٹی باندھے ، ان شہروں میں

پہنچے تھے اور اب دکانیں چلا رہے ہیں اور سوٹ پہنے اور مغربی بیویاں لیے گھوم رہے ہیں - اس مزدور بھی مسکینی کے باوجود لمبی سے لمبی سیاحت کا حوصلہ کر سکتے ہیں -

(۲) مسکینی ہر جگہ ذلیل ہے اور دولت مندی ہر جگہ سنگدل ہے اس لیے کہ وہ غریب کو روٹی دیے بغیر عیش کی طلبگار رہے اور آرام میں غرق ہے - البتہ مشرق میں مسکینی زیادہ ذلیل ہے اور زیادہ سنگدل ہے دولت مندی -

(۳) انسان مشرق اور مغرب دونوں میں یکساں نالائق ہے مگر مغرب میں معزّز نالائق اور مشرق میں نالائق اور یہ کہ ہزاروں اور لاکھوں برسوں کے بعد بھی آہ کہ انسان آج تک لائق نہ ہو سکا -

(۴) انسان لیاقت تک پہنچ تو نہیں سکا - لیکن لیاقت کی طرف بڑھ ضرور رہا ہے - جیسا کہ قوت کی طرف بڑھ رہا ہے - لہٰذا نا امیدی نہیں ہے اس بات سے کہ وہ آگے چل کر لائق بن جائے -

(۵) وہ لائق صرف اس زمانے میں بنے گا جس زمانہ میں سیّاروں کی تسخیر کا سلسلہ شروع کر دے گا اور چاند ، مریخ وغیرہ وغیرہ جیسے قریبی سیّاروں کو مسخّر کر لے گا -

(۶) مغرب مشرق سے زیادہ ذہین نہیں البتہ مغرب کی ذہانت فلسفیانہ ہے مشرق کی ذہانت شاعرانہ ہے اسی فرق نے مغرب کو آسمان

پر پہنچا دیا اور مشرق کو تحت الثریٰ میں پھینک ڈالا ۔ اسی لیے مشرق کا فلسفہ بھی ایک قسم کی شاعری ہے اور اسی لیے مشرق کا فلسفہ مابعدالطبیعیاتی شاخ سے بہت کم نکل سکا اور طبعیاتی شاخ میں بہت کم داخل ہو سکا اور اسی لیےمغرب نے ایجادوں سے دنیا کو بھر دیا اور مشرق صرف باطن اور مابعدالموت کی تحقیقات میں پھنس کر رہ گیا لیکن جب مغرب کا ظاہر اور علمِ حیات رواں مشرق پر چھا گیا تب مشرق باطن اور مابعد الموت کو بھی بھول گیا اور ظاہر اور علم حیات رواں تو اس سے چھین ہی چکے تھے ۔

(۷) مغرب مشرق سے زیادہ محنتی اور منظم محنتی ہے ۔ مشرق کم محنتی ہے اور غیر منظم محنتی ۔ نتیجہ یہ کہ مغرب زیادہ کام کرتا ہے اور پھل کھاتا ہے ۔

(۸) مغرب مشرق سے زیادہ حسن پرست اور زیادہ عیاش ہے ۔ مگر منظم عیاش اس لیے اس میں مجنوں اور فرہاد کم پیدا ہوئے ہیں اور مشرق مجنونوں اور فرہادوں سے بھرا پڑا ہے ۔

(۹) مغرب مشرق سے زیادہ اولوالعزم اور حوصلہ مند ہے ۔

(۱۰) مغرب مشرق کی نسبت کم مردہ پرست اور کم شخصیت پرست ہے اسی لیے وہ مردم خیز زیادہ ہے اور مشرق مردہ خیز زیادہ ہے ۔

(۱۱) مغرب عقل پرست زیادہ ہے ، مشرق وہم پرست زیادہ ہے ،

اسی لیے مغربی زندگی پُرکشش اور نتیجہ خیز زیادہ ہے مشرق کی زندگی بے کشش اور بے نتیجہ ہے۔

(۱۲) مغرب کے عوام نیک ہیں اور وہ ہرگز مشرق کو ستانا نہیں چاہتے لیکن مغرب کے خواص یعنی سرمایہ دار اور سیاست دان البتہ بد ہو سکتے ہیں اور شاید بد ہیں لیکن مشرق کے خواص ان سے بھی زیادہ بد ہیں۔ اسی لیے مشرق کے خواص مغرب کے آلہ کار بن کر مشرق کو مغرب کا غلام بنا دیتے ہیں۔

(۱۳) مغرب کے مذہبی علماء مشرق کے مذہبی علماء سے بھی زیادہ برے ہیں۔ لیکن مغرب کے عوام اب ان کے پنجے سے زیادہ تر نکل چکے ہیں، اسی لیے وہ تیز تیز ترقی کر رہے ہیں، مشرق کے عوام اب تک مذہبی علماء کے پنجے میں کافی جکڑے ہوئے ہیں، اسی لیے وہ ترقی نہیں کر رہے۔

(۱۴) مغرب نہ زوال پر ہے نہ آئندہ ایک نامعلوم عرصے تک زوال پر ہونے والا ہے۔ مغرب نے زمین کی پوری تسخیر کے بعد سیّاروں کی تسخیر کو نصب العین بنا لیا ہے اور اس کے لیے لگاتار جدوجہد بھی جاری کر دی ہے۔

(۱۵) مغرب اب زمینی لڑائیوں کو واقعی بری نظروں سے دیکھنے لگا ہے اور دل سے امن چاہنے لگا ہے کیونکہ اس کی نگاہیں اب تسخیرِ سیّارات پر لگ چکی ہیں؛ اسی لیے اب مغرب میں امن پسندوں کا ایک مستقل گروہ مفکّرین کا پیدا ہو چکا ہے جس

نے دوسری عالمی لڑائی کی بھی مخالفت کی تھی اور اس مخالفت کی پاداش میں چھ سال قید و بند کی سزا بھی جھیلی ہے -

(۱۶) مستقبل قریب میں مشرق مغرب کی برابری نہیں کر سکے گا - مگر یہ کہ مغرب پر خدا کا عذاب آ جائے ، یہ اس لیے کہ مغرب دوسرے سیاروں کی طرف چل پڑا اور مشرق ابھی زمین ہی کی نالیاں کھودنے میں لگا ہوا ہے -

(۱۷) مشرق اور مغرب کی لڑائی میں مشرق ہی نقصان میں رہے گا -

(۱۸) روس بے شک مشرق کا سرتاج بن چکا ہے لیکن مغرب سے پیچھے ہے اور پیچھے رہے گا ، اس وقت تک جب تک مغرب کا نظامِ استبدادی بہ نامِ جمہوریت اور بہ شکلِ جمہوریت قائم ہے -

(۱۹) مشرق میں صرف روس مرکزی ترقی کی اُمید گاہ ہے اور یہ اس لیے کہ روس آدھا مغربی بھی ہے جیسا کہ آدھا مشرقی ہے - عربوں نے بھی اسی لیے ترقی کی تھی کہ وہ آدھے مغرابی تھے ، کیونکہ وہ شام اور فلسطین میں مغربی سمندروں کے ساحلوں پر بھی رہتے تھے ، تب اگر مشرق کو سچ مچ مغرب کے لگ بھگ پہنچنا ہے تو اس کو روس کو اپنا امام بنا لینا چاہیے - دیکھیے چین روس کو امام بنانے کے بعد ہی بڑھ رہا ہے - ترکی چونکہ خود آدھا مغربی ہے اس لیے اس کو روس کی امامت میں آنے کی حاجت نہیں وہ تو خود بخود ترقی کرتا رہے گا ، چنانچہ کر رہا ہے -

(۲۰) مغرب مشرق سے مجموعاً زیادہ حسین نہیں ہے مگر زیادہ خوشنما ہے ۔ البتہ حسن کی بعض خاص قسموں میں مغرب حسن میں بھی آگے ہے ۔ مثلاً ہولینڈ کا آفتابی حسن ، یونان کا شمسی حسن ، انگلستان کا شافی حسن، پیرس کا غزالوی حسن، اسپین کا لطافتی حسن ، لیکن خوشحالی میں تو مغرب مجموعاً آگے ہے ۔

(۲۱) مغرب مشرق کے مقابلہ میں رسمی دین داری میں کم ہے ۔ مگر حقیقی دینداری میں زیادہ ہے ۔ مشرق عبادت میں تیز ہے ، مغربی دیانت میں تیز ہے ۔ مشرق عبادت کے ساتھ ساتھ بلا تکلف ساری برائیاں اور رزالتیں کر ڈالے گا ۔ مغربی عبادت نہیں کرے گا ، مگر بہتیری اچھائیوں اور شرافتوں کے لیے مستعد رہے گا ۔

(۲۲) مغرب زندگی کی پوری قدر کرتا ہے اس لیے نہ قناعت والا ہے نہ بخالت والا ہے نہ کاہلی والا ہے بلکہ پورا حوصلہ مند ، پورا شاہ خرچ، پورا جدوجہد والا ہے ۔ مشرق زندگی کی پوری قدر نہیں کرتا ۔

(۲۳) مغرب شکل پسند ہے ۔ علم میں بھی عمل میں بھی ۔ اس لیے مشکل علموں کو مشکل مسئلوں کو اور مشکل کتابوں کو زیادہ شوق سے پڑھتا ہے اور سوچتا ہے اور حل کر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسی طرح مشکل کاموں میں زیادہ جی لگاتا ہے ۔

چند انکشافات

(۱) ... مسکینی لاعلاج بھی ہے جب تک اشترا کیت وہاں اپنا قدم نہ جما لے، معیارِ زندگی اونچا اور مسرفانہ اور آمدنی کم، نہ معیارِ زندگی گھٹے گا اور نہ آمدنی بڑھے گی۔ اسی لیے مغرب کے لیے اشترا کیت مشرق سے بھی زیادہ ضروری ہے اور غالباً پھیلے گی بھی وہیں پہلے، آثار بھی ایسے ہی ہیں جاہل اور دنی مشرق دل سے اشترا کیت تو کبھی قبول نہیں کرے گا جب تک جہالت اور سفاہت سے نہ نکل جائے۔

(۲) مغرب میں جہالت بھی گدا گری کی طرح جڑ سے ختم ہو چکی ہے، وہاں ان پڑھوں کی زیارت ہو جانا اتنی ہی نادر بات ہے کہ جتنا یہاں جناتوں اور پریوں کی زیارت ہو جانا اتنی اور مجھے تو کبھی بھی زیارت نہیں ہوئی۔ مسکین سے مسکین بھی ملا تو اس کو پڑھا ہی پایا۔

(۳) مغرب میں عورت کی ذلت اور رسوائی، اب تک ختم نہیں ہو سکی، انداز بدل گئے ہیں، پر حقیقت نہیں بدلی ہے، جو عورت اگر مسکین ہے تو اس کو روٹی دے کر اس کی عصمت برباد کی جاتی ہے اگر مالدار ہے تو اس کی شہوت کو تیز کرکے اس کی عصمت لوٹی جاتی ہے۔ یہودی یہاں سب سے بڑا قزاق عصمت ہے کیونکہ وہی یہاں کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے اور بدکاری کی فرصت رکھنے والا۔ مغرب میں عورت کی حیثیت اب تک صرف آلۂ شہوت رانی اور

رونقِ انجمن کی حیثیت ہے ۔ لیکن مشرق کی عورت مغرب کی عورت کو اس کی بد حالی کی وجہ سے زبانِ طعن نہیں کھول سکتی کیونکہ مشرق کی عورت تو اب تک آدمی ہی نہیں مانی گئی ہے ۔

(۴) مغرب میں دولت عیسائیوں کے پاس نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر غلط فہمی سے سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ نعمت یہودیوں کا حصہ ہے ۔ مغرب میں عیسائی ایسے ہی غریب ہیں جیساکہ مشرق میں مسلمان غریب ہیں اور اپنے خاص ملکوں میں بھی غریب ہیں اور سلطنتیں رکھتے ہوئے بھی غریب ہیں ، مغرب میں یہودی ہی ہیں جو مرکزی تجارتوں اور بین الاقوامی بنکوں کے مالک ہیں ۔ البتہ مشرق میں یہودیوں کے دوش بہ دوش عیسائی بھی دولت مند ہیں، خصوصاً اسلامی ملکوں میں جہاں دونوں مسلمانوں کا شکار کھیلتے ہیں ۔

(۵) مغرب میں تمدن کی ہر شاخ مشرق سے کہیں زیادہ ہری بھری ہے ۔ مغرب کی عمارتیں اچھی مغرب کی کارگاہیں اچھی ، مغرب کی نمائش گاہیں اچھی ، مغرب کے راستے اچھے، مغرب کی دکانیں اچھی ، مغرب کی آرائشیں اچھی ، مغرب کی تہذیبیں اچھی اور مغرب کی کیا چیز نہیں اچھی البتہ مشرق یہ کہہ سکتا ہے کہ مغرب کی روحیں نہیں اچھی ، مشرق کی بھی روحیں کب اچھی ۔ اگر مشرق کی روحیں بھی اچھی ہوتیں اور کوئی دوسری چیز نہ بھی اچھی ہوتی تب بھی مغرب کی بد روح مشرق پر مسلّط ہو جاتی ۔

(٦) مغرب کی تمام اچھائیوں کی جڑ اس کے علم کی اچھائی ہے -

(۷) مغرب مشرق کو علم سکھاتا ہے ، یا نہیں - یہ سبھی غور و فکر کے مسئلوں میں سے ایک ہے اور میری تحقیق اس بارے میں اب یہی ہے کہ نہیں سکھاتا - پوست تو سکھاتا ہے اور بڑی دھوم دھام سے سکھاتا ہے مگر مغز نہیں سکھاتا اور اس وقت تک نہیں سکھائے گا جب تک مشرق مغرب سے حریفی نہ چھوڑ دے اور عالمیت کے عقیدے میں سچا نہ ہو لے (سفر نامۂ رہبانی ۹۲-۱۰۱)

سیاحت میں کیا سیکھا اور کیا سکھایا ؟

سیاحت میں میں نے دوسروں سے یہ سیکھا کہ :

(۱) مشرقیوں کو مغرب میں پورا پرہیزگار بن کر رہنا چاہیے اگر وہ چاہتے ہوں کہ مشرق کی تھوڑی سی بھی عزت مغرب میں قائم کر دیں ، یہی ایک چیز ہے جو مغرب میں جنسِ کمیاب کی حیثیت سے مانگی جا سکتی ہے ادھوری پرہیزکاری کی یہاں کوئی قیمت نہیں، وہاں کا فاسق بھی جو رئیس الفاسقین ہے پرہیزگاری کی عزت کرتا ہے -

(۲) علم میں فلسفہ یہاں عزّت کی چوٹی پر ہے تب اگر علمی عزّت کمانا چاہتے ہو تو فلسفہ کی قابلیت کی نمائش کرو -

(۳) یہاں باطنیت کی پیاس بھی زیادہ ہے اور یہاں کے لیے باطنی بڑی قیمت رکھتا ہے -

(۴) یہاں آداب کے فروع اصول کی سی قیمت رکھتے ہیں - لہٰذا فروعِ آداب میں بھی مت چوکو ورنہ سخت دھوکہ کھاؤ گے اور بہت نقصان اٹھاؤ گے -

(۵) یہاں کالوں اور گوروں کا فرق اس سے زیادہ سنگین ہے جتنا فرق مشرق میں اس مذہب والوں اور اُس مذہب والوں میں سنگین ہے ، پس عزت چاہتے ہو تو کالوں میں مت رہو - البتہ اگر محبت چاہتے ہو تو کالوں ہی میں رہو -

(٦) کالے دولت اور علم میں تو گوروں سے کم ہیں کیونکہ گوروں ہی میں یہودی بیٹھے ہوئے ہیں ، لیکن شرافت اور محبت میں گوروں سے زیادہ ہیں اور انھیں میں وہ ہیں جو مسلمان ہو گئے ہیں ، گوروں میں اسلام کے ساتھ بہت تعصب ہے - کالوں میں بالکل نہیں ہے -

(۷) پچھلی راتوں کو اکیلے مت چلو - مغرب میں بد معاشوں کا ایک گروہ ایسے اوقات میں اور ایسے مواقع پر چلتا رہتا ہے - معلوم نہیں کب اس گروہ والوں سے نہیں مڈ بھیڑ ہو جائے پھر تو آپ کا بچ جانا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے -

(۸) مشرق کا طالب علم مغرب میں سیکھتا بہت کم ہے اور کھیلتا بہت زیادہ ہے ، اس لیے مشرق کو مغرب سے اس گروہ کے

ذرایعے بہت کم فائدہ پہنچتا ہے، پتلون پوشی اور عورت بازی تو البتہ رواں ہو جاتی ہے لیکن علم و فن اور ذہن و دماغ کے کمالات رواں ہو نہیں پاتے ۔

(۹) مشرق کا طالب علم مغرب میں عموماً ملحد یعنی بے دین ہو جاتا ہے لیکن یہ جانے ہوئے بغیر ملحد ہو جاتا ہے کہ الحاد کیوں قبول کے قابل ہے ۔

(۱۰) مغربیوں سے حسنِ اخلاق سیکھا، جوشِ عمل اور ذوقِ استہلال سیکھا، جرأتِ قلندرانہ سیکھی، ہمتِ مردانہ سیکھی، عشق و محبت کا ولولہ سیکھا ، تجویز و تنقید کا حوصلہ سیکھا ، سیرِ فطرت کا شوق سیکھا ، مجلس و خلوت کا ذوق سیکھا ، گفتگو اور بحث کے آداب سیکھے، نشست و برخاست کے اطوار سیکھے ، چمچے سے کھانا سیکھا ، گانا بجانا سیکھا ، ضبط و نظم سیکھا، صبر و توکل سیکھا ، غرضیکہ ظاہری صیغے میں مغرب سے آدھی زندگی سیکھی اور اس سیکھنے کے لیے مغرب کا احسان مانتا ہوں اور شکر گزاری کرتا ہوں اور مدت العمر مانتا رہوں گا اور کرتا رہوں گا ۔ پھر یہ چیزیں میں نے مغرب کے کالوں ہی سے سیکھی کیونکہ میں کالوں ہی میں رہا ، کالوں ہی میں رہ بھی سکتا تھا ، کالوں ہی میں رہنا بھی چاہتا تھا ۔ میں گوروں سے بھی کبھی کبھی چھو جاتا رہا اور ان میں بھی بہت اچھے اچھے لوگ دیکھے مگر ان میں یہ سو چکر زیادہ جی نہیں لگایا کہ انھوں نے اچھے ہوتے ہوئے بھی کالوں کی کم تر ہستی کو روا اور جائز رکھا۔

میں نے ان میں سے کچھ کو کالوں کے بارے میں نصیحت کرکے بھی دیکھا مگر یہ پایا کہ نصیحت کے تیر نشانے پر نہیں بیٹھے، پھر یہ بھی کھل گیا کہ خود مشیت کی طرف سے ابھی اس قسم کی تیر اندازی کی کامیابی میں کچھ دیر ہے -

میں نے مغرب سے سیکھا بہت ، جیسا ابھی کہا گیا ہے اور سکھائی صرف ایک بات وہ ایک بات کیا تھی ؟ وہ ایک بات فلسفۂ ربّانیہ تھا ـ میں نے مغرب کے کالوں اور گوروں دونوں کو یہ بتایا کہ فلسفۂ ربّانیہ کیا چیز ہے اور کس قیمت کی چیز ہے ـ سیکڑوں کو باقاعدہ املائی درس دیے ، ہزاروں کو تقریروں کے ذریعے آگاہ کیا ، گفتگو میں اسی پر ایک کتابچہ بھی لکھ ڈالا جس کو ایک تجارتی مکتبہ کی فہرست کتب میں جگہ بھی مل گئی ـ غرضیکہ ہر طور سے سکھایا اور یہ وہم بھی رکھتا ہوں کہ کچھ لوگوں نے سیکھا بھی اس معنے میں کہ اس کا اعتقاد بھی باندھ لیا ـ فلسفۂ ربّانیہ کیا چیز ہے ؟ اور اس کی کیا قیمت ہے ؟ یہ بتانے کا موقع یہ سفر نامہ نہیں ہے ، سفر نامہ تو صرف واقعاتی تذکروں کا سرسری اخبارچہ یا روزنامچہ ہے ، پھر بھی اس کی ایک ہلکی سی تصویر کہیں نہ کہیں آ رہے گی اور یہاں بھی اس کی اہمیت کی طرف اتنا اشارہ تو سپردِ قلم کر دیا جاتا ہے کہ یہ چیز کچھ نہ کچھ تو خاص اہمیت رکھتی ہی تھی کہ مغرب کے لوگ اس کو سیکھنے بیٹھ گئے اور اتنی قیمت لگائی کہ اس کی ایک کتاب کو اپنے خرچ سے شائع کرنے کھڑے ہوگئے ـ (سفر نامۂ ربّانی ۱۰۱ : ۱۰۴)

مغرب اور مشرق کی عوارضی رنگا رنگی شیونی اختلافیت

(۱) میں جب یہ کہتا ہوں کہ مغربی اور مشرقی ایک عالمی قوم کے گروہ ہیں، پھر یہ کہ مغرب اور مشرق دونوں ایک ہی عالمی وطن کے دو خطے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ ان دونوں میں اور ان کے متعلقہ خطوں میں عرضی سطحی خصوصیتوں کے بھی کچھ فرق نہیں ہیں ۔ اس قسم کے فرق تو ہیں اور ان فرقوں کو جاننا بھی چاہیے تاکہ علم الانسان تنگ اور ادھورا نہ رہ جائے بلکہ وسیع اور مکمل بن جائے ۔ البتہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ ان فروعی فرقوں کو سنگین اہمیت دے دی جائے اتنی اہمیت کہ مغربی اور مشرقی گروہوں کو دو قومیں بنا دیا جائے اور دونوں کے بیچ غیریت اور ضدیت اور نفرت اور دشمنی کی گہری گہری خلیجیں پیدا کر دی جائیں اور اس جہالت اور حماقت سے انسانیت مطلق کو نقصان پہنچایا جائے ۔

دعوت محمدی ﷺ نے اس جہالت و حماقت کو یہ بتا کر کہ اللہ رب المشارق و المغارب ہے یعنی مشرقوں اور مغربوں کا پروردگار ہے، پھر یہ کہہ کر مجھ کو زمین لپیٹ کر سارے مشرقوں اور مغربوں کے ساتھ دکھائی دی گئی اور یہ ہو کر رہے گا کہ میری امت ان سب تفرقوں کو اپنے نظام وحدت میں سمیٹ کر متحد کر دے گی اور ایک بنا دے گی ۔ مگر افسوس کہ دوسرے تو دوسرے

محمدیوں نے بھی دعوت محمدی کے اس نظریہ حاکمیت اور وحدت عالمی کو بھلا ڈالا اور قومیتی اور وطنی تفرقوں میں ڈوب کر رہ گئے - لیکن کیا سمجھتے ہو کہ اس حادثے سے دعوت محمدی ﷺ مٹ گئی - ہرگز نہیں ؟ دنیا کے توحیدی عوامی تفرقہ بازیوں کے میدان کی شکست و ریخت کر چلے ہیں - انھیں عوامل میں سے ایک عامل میرا فلسفہ ربّانیہ اور میری تحریک ربانیت بھی ہے - آثار بتا رہے ہیں کہ دعوت محمدی ﷺ مٹی نہیں ہے نہ مٹے گی بلکہ قائم ہے اور قائم رہے گی، اور عمل کرتی رہے گی یہاں تک کہ ایک دن اپنی توحیدی مہم کو کامیابی کی ملکوتی چوٹی پر پہنچا دے گی - شاید اُس بہشتی عہد میں میرا جسم زندہ نہ ہوگا - مگر میری زندہ روح اس عظیم العظیم کامیابی کو دیکھ کر شاعر حکیم شیراز کا یہ شعر پڑھتی ہوئی رقص کناں ہو جائے گی :

شکرِ ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد
حوریان رقص کنان ساغرِ شکرانہ زداد

اب ان عرضی ، سطحی اور وقتی فرقوں کو بھی سن لیجیے - جنھوں نے تفرقوں کے طوفان کھڑے کر دیے ہیں اور صرف ان ہی فرقوں کو نہ سنیے جو مغربی اور مشرقی دو بڑے گروہوں اور دونوں کے متعلقہ خطوں کے درمیان میں ہیں ، بلکہ خود مغربی چھوٹے چھوٹے گروہوں کے درمیان کے فرق بھی سن لیجیے سرسری اور اجمالی درجے میں کیونکہ مقدمہ خصوصاً مقدمہ سفر نامہ میں تفصیلی اور غائری بیانوں کا محل نہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے -

(۱) مغرب یعنی یورپ مع امریکہ عموماً ٹھنڈا ہے۔ امریکہ میں تو کچھ گرم علاقے بھی ہیں جیسا کہ کلی فورنیا کی بابت سنا ہے۔ لیکن یورپ تو پورے کا پورا ٹھنڈا ہے اگرچہ اس کے مختلف علاقے ٹھنڈ کے مختلف درجے رکھتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ زیادہ ٹھنڈا ہے۔ فرانس اتنا ٹھنڈا نہیں ہے، فن لینڈ بہت ہی ٹھنڈا ہے، برطانیہ اتنا ٹھنڈا نہیں ہے۔ مشرق عام طور پر ٹھنڈا نہیں ہے۔ مشرق کے کچھ علاقے ضرور ٹھنڈے ہیں اور اس بلا کے ٹھنڈے کہ مغرب کی ٹھنڈ بھی اس کے مقابلہ میں بار بار کان پکڑ کے اٹھے بیٹھے۔ مثلاً سائبیریا کا علاقہ یا شمالی افغانستان اور شمالی ایران کے علاقے، مگر مشرق کے زیادہ علاقے گرم ہی ہیں اور بڑے بڑے موذی درجوں کے گرم، مثلاً دشتِ عرب اور صحرائے اعظم افریقہ۔ اس ٹھنڈ نے مغربیوں کو محنتی بنا دیا ہے اور اس گرمی نے مشرقیوں کو کام چور کر دیا ہے۔ پھر اس ٹھنڈ نے مغربیوں کو کثیرالضرورت بنا دیا ہے اور کثیرالجہد کر دیا ہے۔ اس گرمی نے مشرقیوں کو قلیل الضرورت اور قلیل الجہد بنا ڈالا ہے۔ پھر اس ٹھنڈ نے مغربیوں کو فلسفی اور موجد بنا دیا ہے اور اس گرمی نے مشرقیوں کو فیلسوفیت اور موجدیت کے اونچے مرتبۂ علم سے محروم کر دیا ہے۔ پھر اس ٹھنڈ نے مغربیوں کو مہم باز اور تسلط باز بنا دیا ہے اور یوں وہ پوشیدہ اسرارِ فطرت کو علم اور عملی جدوجہد کے ہاتھوں کھنگال ڈالنے پر کمر کس کر کھڑے ہو گئے اور پھر ان نئی نئی طاقتوں کے ذریعے جنھیں انھوں نے چھپے اسرارِ فطرت کو

کھنگال کر اور ان کی روشنی میں نئے لئے انتہائی طاقتور ساز و سامان تیار کر کے حاصل کر لیا تھا، پورے مشرق پر تسلّط ہو گئے اور اسی سرگرمی نے مشرقیوں کو سہم بازی اور تسلّط بازی بلکہ مدافعت بازی سے بھی محروم بنا کر ایک طرف چھپے اسرارِ فطرت کے علم سے جاہل بنا دیا اور دوسری طرف ان نئے انتہائی طاقتور ساز و سامان سے تہی دست کر دیا جو چھپے اسرارِ فطرت کے انکشافوں ہی کے ہاتھوں تیار ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف مغربیوں کے تسلّط سے بچنے کے لائق نہیں رکھا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربیوں کے غلام بن گئے ۔

لیکن یہاں اس نکتہ کو بھی جان لینے کی ضرورت ہے کہ محض ٹھنڈ نے مغربیوں کو یہ جلالتِ شان نہیں بخشی۔ ٹھنڈ تو مشرق کے بھی کچھ علاقوں کو حاصل ہے مگر وہ تو ایسے نہیں بن سکے جیسے مغربی بنے ۔کیا کر لیا شمالی افغانستان اور شمالی ایران نے اور کیا کر لیا سائبیریا کے برفستان نے ، یہ ایسے ہی جاہلِ مطلق اور ناکارہ مجسّم بن گئے جیسا کہ مشرق کے گرم خطّے والے۔ ٹھنڈ کے ساتھ ساتھ یقیناً دوسرا عامل بھی ہوگا جس نے مغربیوں کو جدوجہد اور ترقی کے میدان میں آتارنے کی کار سازی کی ۔ یقین کے ساتھ تو نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ دوسرا عامل کون ہے ، البتہ گمان کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ یہ دوسرا عامل غالباً خطۂ مغرب کی یہ اخراجِ اسرابکہ ، پُرخطر چھوٹائی اور خطّۂ مشرق کی خطرناک بڑائی مع احساسِ وحدتِ خطوی کا معاملہ تھا ۔ یعنی یہ بات تھی کہ خطۂ مغرب اخراجِ

امریکہ کے بعد بہت ہی چھوٹا تھا ۔ اتنا چھوٹا جتنا کہ مشرق کے صرف ایک علاقے سائبیریا اور اس کے بسنے والے ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں۔ پھر وہ یہ سوچتا تھا کہ خطہ مشرق اتنا بڑا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہمیں ایک لقمہ بنا کر نگل جائے اور ہمارے اندر کے بسنے والوں کو غلام بنا لے اور پھر اس کی اس سوچ کو چند واقعات سے قوت بھی مل گئی ۔ اس نے دیکھا کہ مشرق سے گاتھ اٹھے اور روما کو روندتے ہوئے فرانس پر چھا گئے پھر دیکھا کہ مشرق سے عرب اٹھے اور جنوبی اسپین اور جنوبی فرانس کو ہڑپ کر گئے ۔ پھر مشرق سے ترک اٹھے اور مشرقی یورپ کو لے بیٹھے۔ پھر مشرق سے تیمور اٹھا اور مغربی روس کو روندتا ہوا پولینڈ تک پہنچ گیا ۔

اس سوچ نے اور اس دیکھ نے انھیں دوسری سوچ یہ دلائی کہ ہماری خطوی چھوٹائی اور تعداد آبادی کی کمی صرف قوت کی زیادتی سے تلافی پا سکتی ہے اور قوت کی زیادتی غیر معمولی محنت و جد و جہد اور فوق المعیار بہادری ، جان بازی، وسیع الفکری اور روشن خیالی کے بغیر شکار نہیں بن سکتی ۔ اس ٹھنڈ کی فطری سوچ نے قوت ارادی کی مدت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی حرکت فکری و علمی اور تحریک اکتسابی و جہدی کو مغربیوں میں ابھارا اور یوں وہ ارتقائی زندگی کی سڑک پر رواں ہوئے ۔ مشرق کے ٹھنڈے علاقوں میں یہ احساس نہیں چمکا ۔ اس لیے وہ خالی ٹھنڈ سے چمٹے رہ گئے اور اس ٹھنڈ کا علاج انھوں نے صرف الاؤں کی بھڑکتی ہوئی آگوں، سموروں کی گرم پوستینوں ، شراب کے آتشیں گھونٹوں اور مہم غارت گری اور میدان کارزار کی گرمیوں میں ڈھونڈھ لیا تھا ، لیکن

محض یہ علاج کب تک چلتا اور کہاں تک چلتا ۔

(۲) مغرب اخراجِ امریکہ کے بعد قلیل القداد خطّہ ہے اور غذا میں مشرق کا محتاج ہے ، ساتھ ہی کثیرالمعدنیات ہے اس لیے ایسے سامانوں کا سامان دار ہے جن کے عوض مشرق سے غذائی اجناس خرید سکتا ہے، لیکن ان سامانوں کو شکمِ زمین سے نکال کر پشتِ زمین پر کارآمد صورت میں پھیلا دینا علم المعدنیات پر منحصر ہے ۔ جنسِ تبادلہ بنا ڈالنا علم الصنعت پر منحصر ہے، پھر ان سامانوں کو مشرق کے ہاتھ بیچنا علم التجارت پر منحصر ہے ۔ یوں مغرب علم المعدنیات ، علم الصنعت ، علم التجارت کے اعلیٰ پیمانہ پر جانے کے لیے مجبور ہوگیا اور یوں وہ صنعتی ، تجارتی اور سائنسی خطّہ بن گیا ۔ مشرق کے پاس غذائی سامان بہتات سے تھا اس لیے وہ عموماً زراعتی خطّہ ہو کر رہ گیا اور ترقیوں سے محروم ہوگیا ۔ مختصر یہ کہ قلیل الغذائی نے مغرب کو آسمان پر پہنچا دیا اور کثیرالغذائی نے مشرق کو زمین ہی پر رینگتے چھوڑ دیا ۔

(۳) مغرب زیادہ تر بحری خطہ ہے اس کے اکثر علاقے سمندر ہی پر واقع ہیں ۔ برطانیہ تو خیر جزیرہ ہی ہے۔ فرانس بھی سمندر پر ، اٹلی بھی سمندر پر ، بلقانی ریاستیں بھی سمندر پر ، اسکنڈی نیویا کے علاقے بھی سمندر پر ، بلجیم ، ہالینڈ ، اسپین ، پرتگال بھی سمندر پر ، پھر ان کے سمندر بھی تجارتی موزونیت والے سمندر ہیں ۔ اس چیز نے بھی مغربیوں کو

اعلیٰ تجارتی قوم بنا دیا اور اسی کے ساتھ ولولۂ تسلّط کا بھی مالک بنا دیا ۔ سمندروں کی لہریں اچھل اچھل کر ان میں اس ولولہ کو بھی اچھالتی رہتی ہیں کہ آگے بڑھو دنیا تمھاری ہے ۔ میری لہروں پر سوار ہو کر بڑھو ، پھر کون خطّہ اور کون علاقہ ہے جو تمھارے حوصلوں کے سامنے سر نہ جھکا دے ۔

(۴) مغرب میں برتری کا تخیل بھی مدتوں سے کام کر رہا ہے ۔ مغربی عام طور سے اپنے کو مشرق سے برتر سمجھتے چلے آ رہے ہیں ۔ پھر ان کا یہ تخیّل شیخ چلیانہ تخیّل نہیں ہے بلکہ عاملانہ تخیّل ہے ۔ وہ اپنی برتری کے تخیّل کو عملی سرگرمیوں کے پانی سے سینچتے بھی رہتے ہیں، اس لیے یہ تخیّل پھل بھی دیتا رہتا ہے ۔ پھل ہی تخیّل کو نئی مضبوطی دیتا ہے، اس لیے مشرق عرصے سے برتری کے تخیّل سے اول تو بالکل خالی ہی ہے ، اگر اس کے دل کی گہرائی کو ٹٹولا جائے تو وہ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہے کہ کبھی کبھی برتری کی شیخی میں زبانی بڑبڑا اٹھتا ہے؛ لیکن اگر بالفرض اس کے دل میں بھی یہ بیج پڑا ہو تب بھی اتنا تو یقینی ہے کہ وہ اس بیج کے لیے عمل میں کچھ نہیں کرتا ۔ اس لیے یہ بیج اس کے دل کے کھیت میں صرف سوکھ جانے اور سڑ جانے کے لیے کہیں دبا دبا پڑا ہوگا جو عرصے سے کبھی پھوٹا نہیں اور اس میں سے کونپلیں نہیں نکلیں ۔

(۵) مغرب میں عرصے سے سچائی آ گئی ہے ۔ جہاں سے بھی آئی

ہو - جو کچھ وہ سوچتا ہے سچائی سے سوچتا ہے وہ جو کچھ بولتا ہے سچائی سے بولتا ہے ، جو کچھ کرتا ہے سچائی سے کرتا ہے، اس لیے مغرب کی زندگی سراپا حقیقت اور سر تاپا اصلیت بن گئی ہے - چونکہ سچائی کے ساتھ بہادری لازم ہے اس لیے مغرب میں بہادری بھی آ گئی- اسی سچائی اور بہادری کی وجہ سے مغرب کامیابی پر کامیابی ہی بٹورتا رہتا ہے - نا کامیابی اس کے پاس نہیں پھٹکتی - مشرق جھوٹ میں ڈوبا ہوا ہے - جھوٹ کا ایک بچہ بزدلی بھی ہے - پس اس میں بزدلی بھی آ گئی ہے - اس کا لازمی پھل ناکامیابی اور زوال ہے -

(۶) مغرب عقل کو وہم پر مقدّم رکھنے لگا ہے اس لیے وہ عرصے سے جوہرِ عقلیت کا بھی مالک ہوگیا ہے - اس کی دین داری بھی عقلی قسم کی دین داری بن گئی ہے ، اس نے جوہرِ عقلیت کو کمانے میں پوری قربانی دی ہے - عقلیت کے جرم میں کتنے ہی لوگ زندہ جلا دیے گئے اور دوسرے عذابوں کے ساتھ مارے گئے ، لیکن انھوں نے اُف نہیں کیا - مغرب نے عقلیت کی خاطر اپنی مذہبی پاپائیت سے پوری جنگ کی اور بڑی بڑی ہولناک قربانیاں دینے کے بعد اس کو فیصلہ کن شکست دے دی، جس کے نتیجہ میں اس کی عقلیت کی اڑان بے روک ٹوک اور لامحدود سی ہوگئی اور اسے ایک ایسا جامع اور حاوی فلسفہ مل گیا جس کی ایک شاخ سائنس اور ایجاد بھی ہے جس کی برکت سے وہ زمین پر پورا پورا مسلّط ہو چکنے کے بعد

آسمانوں پر بھی متوجہ ہو گیا ہے اور زمین کے علاوہ دوسرے
سیاروں کا بھی شکار کھیلنے میں لگ گیا ہے۔ زمین پر قبضے
کا یہ حال ہے کہ زمین کی پیٹھ ہی پر سوار نہیں ہو گیا ہے
بلکہ اس کے پیٹ کو بھی اس کی آنتوں تک دوہ چلا ہے
اور اس کے بھیتر کے چھپے ڈھکے خزانوں کو بٹور بٹور کر
اوپر پھینکنے لگا ہے اور کوئی نہیں ہے جو اس کو اس گستاخانہ
غارت گری سے روک سکے۔ یہ اور بات ہے کہ بائیبل بھی
اس حرکت پر منہ بسورے بیٹھی ہو اور بائیبل پرست جماعت
پادری بھی غصے میں اپنے ہاتھ کاٹ رہی ہو۔

مشرق عرصے سے جوہر عقلیت سے یکسر خالی ہو گیا ہے۔ اس
کو عقلیت کی جگہ وہمیت نے لپیٹ رکھا ہے۔ وہ آج بھی مولویوں،
پنڈتوں، پنگیوں اور سادھووں کے کہنے میں ہے اور کتابوں اور
نسخوں سے لپٹا ہوا ہے۔ اس میں ہمت نہیں ہے کہ لفظی اور
خیالی دنیا سے تھوڑی سی مہلت لے کر چمکتی دمکتی تجلی گاہ
فطرت کو بھی ایک نظر دیکھے اور اس کے اشاروں اور بھیدوں
کو سمجھنے پر بھی فرصت کا ایک لمحہ خرچ کرے۔ نتیجہ
یہ ہے کہ اس کو فلسفہ نہ مل سکا، نہ تخیلی صورت میں نہ عملی
صورت میں، نہ فلاسفی کی شکل میں، نہ سائنس کی شکل میں اور یوں
وہ زمین کو بھی نہ پا سکا، آسمانوں کو تو کیا پاتا۔ خود بھی تسلط
نہ جما سکا، دوسروں پر تسلط تو کیا کرتا۔

(۷) مغرب عرصے سے فکر اور تنقید کا عادی چلا آ رہا ہے۔ اسی
فکر و تنقید نے اس کو عقلیت دی، جیسا کہ عقلیت نے اس

کو فلسفہ بخشا ، پھر فلسفہ نے اس کو قوت عطا کی، مشرق فکر و تنقید کے بجائے عرصے سے تنہا گمان اور تقلید سے چمٹ گیا اور ایسا چمٹا ہے کہ فکر و تنقید کو نہ صرف لاطایل سمجھ بیٹھا بلکہ غلط اور باطل بھی ٹھہرا بیٹھا ۔ اس وہم پر کہ فکر و تنقید ایمان و ایقان کے دشمن ہیں اور دین و آخرت کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں ۔ اس جہالت و حماقت کے سبب وہ مغرب کے مقابلہ میں جانور بن کر رہ گیا، یہاں تک کہ جب مغرب کی شاگردی کا طوق اس کی گردن میں چار و ناچار پڑ گیا ۔ تب بھی وہ مغرب سے اس کی فکر و تنقید اور عقلیت و فلسفیت کو نہ سیکھ سکا ۔ زیادہ سے زیادہ :

چار پائے برو کتابے چند

(۸) مغرب عرصے سے دقیق النظری اور وسیع القلبی کا حامل چلا آ رہا ہے ، اس نے اپنے علم کو وسیع اور نظر کو دقیق بنانے کی غرض سے مشرق کے علم کو بھی پوری کشادہ دلی سے دیکھا بھالا اور پوری باریک نظری سے اس کو جانا پہچانا ، پھر پوری فراخدلی سے اس کو اپنی چیز سمجھ کر سمیٹ بیٹھا اور یوں وہ خود اپنے اور مشرق کے سارے علم کا خزانہ دار بن کر علم کا مجموعی خزانہ بن گیا ۔ پھر علم میں مشرق اس سے کیسے آنکھ ملا سکتا تھا ۔ مشرق کے پاس ا کیلا اس کا اپنا علم تھا ۔ مغرب کے پاس اس کا اپنا علم بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ مشرق کا علم بھی تھا ۔

مشرق عرصے سے بہت سطحی النظر اور تنگ دل چلا آ رہا ہے ۔ اس نے مارے سطحی النظری اور تنگ دلی کے مغرب کا علم سمیٹنے کی مطلق تکلیف نہیں اٹھائی اور اکیلے اپنے علم پر دھونی رما کر بیٹھ گیا ۔ پھر یہ بھی کیا کہ مدتوں مغرب کے علم کو حقارت سے دیکھتا رہا اور مغرب کو جاہل ٹھہراتا رہا اور اس سے کچھ لینے میں عار کرتا رہا، حالانکہ یونان کے چمک اٹھنے کے بعد وہ جو کچھ بھی پونجی علم کی رکھتا تھا مغرب ہی کے دستر خوان کا جھوٹا تھا کیونکہ یونان مغرب ہی کا تو ایک جزو ہے مگر آہ مشرق کی جہالت کہ مدتوں اس کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ یونان مشرق نہیں ہے مغرب ہے ۔

اس سطحی النظری اور تنگ دلی کے سبب مشرق مغرب کے مقابلے میں طفل دبستان ہو کر رہ گیا مگر اس کا یہ غرور آج بھی دھندلے دھبے کی حد تک باقی ہے کہ ہم علم میں مغرب سے بہتر نہیں ہیں تو کم تر بھی نہیں ہیں ۔

(۹) مغرب میں مُردہ پرستی اور ماضی پرستندگی نہیں ہے ۔ زندہ پروری اور حال نوازی ہے ۔ وہ گذرے لوگوں کو پوجتے نہیں نہ گذرے زمانہ کو پوجتے ، وہ گذرے ہوؤں کی یاد ضرور کرتے ہیں اور اتنا کرتے ہیں کہ ان کی یادگاریں کھڑی کر دیتے ہیں ، حتی کہ مجسمے بنا ڈالتے ہیں لیکن ان کے وظیفے نہیں پڑھتے، نہ ان کے ناموں کی دھونیاں رما بیٹھتے ہیں ، نہ ایسا کرتے ہیں کہ ان کی خاطر زندوں کو ٹھکرا دیں یا نیچا دکھائیں یا ان کی طرف سے منہ پھیر لیں اور ان کو بے یار

مددگار چھوڑ دیں، بلکہ ان کی طرف زیادہ دوڑتے ہیں، ان کے گرد زیادہ حلقے باندھتے ہیں ، ان کی طرف زیادہ تاکتے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ ہی میں زیادہ طاقت ہوتی ہے -

پھر وہ اگلوں اور موجودوں کے کارناموں کے بے لاگ مقابلے کرتے ہیں اور اگر موجودوں کے کارناموں میں کوئی واقعی بڑھوتری ہے تو وہ بلا تردد ان کو گلوں پر بڑھا بھی دیتے ہیں اور اتنا ضرور ہی کرتے ہیں کہ زندوں کو اگے چلاتے رہتے ہیں اور انھیں کے پیچھے چلنے لگتے ہیں، چاہے وہ مُردوں سے کچھ گھٹیا بھی ہوں ، پھر ان کو اپنی مددوں سے مُردوں کے برابر پہنچا دینے کے یا آگے بڑھا دینے کے حوصلے بھی کرتے ہیں مگر یہ بیہودگی بھی نہیں آنے دیتے کہ اگلوں کا حق مار بیٹھیں - بہرحال ان کے ہمیشہ اصلی رابطے زندوں ہی سے قائم ہوتے ہیں اور مُردوں سے صرف اتنا جتنا ضرورت چاہے، نہ یہ کہ مبالغے کریں اور غلو برتیں، یہاں تک کہ زندے مُردے ہو جائیں -

مشرق مُردہ پرست ہے ، یہاں زندے حقیر ہیں اور مُردے عظیم، نتیجہ یہ کہ زندگی ہر آنے والی منزل میں صرف دم توڑنے کے لیے ہوتی ہے اور موت تسلّط بڑھانے کے لیے- نتیجہ ہر نئی منزل میں صرف زوال نکلتا ہے - مُردے آخر کہاں تک سہارے دیں، ان کے گذرے ہوئے کارنامے محض ذکر و تذکرہ سے کہاں تک زندگی کی طاقت دکھائیں ، زندے چاہتے ہیں کہ زندگی کے جوہر اور طاقت کے کرشمے دکھائیں مگر انھیں ابھرنے نہیں دیا جاتا ، انھیں دبا دیا

مشرق عرصے سے بہت سطحی النظر اور تنگ دل چلا آ رہا ہے -
اس نے مارے سطحی النظری اور تنگ دلی کے مغرب کا علم سمیٹنے
کی مطلق تکلیف نہیں اٹھائی اور اکیلے اپنے علم پر دھونی رما کر
بیٹھ گیا - پھر یہ بھی کیا کہ مدتوں مغرب کے علم کو حقارت سے
دیکھتا رہا اور مغرب کو جاہل ٹھہراتا رہا اور اس سے کچھ لینے میں
عار کرتا رہا، حالانکہ یونان کے چمک اٹھنے کے بعد وہ جو کچھ بھی
پونجی علم کی رکھتا تھا مغرب ہی کے دستر خوان کا جھوٹن تھا
کیونکہ یونان مغرب ہی کا تو ایک جزو ہے مگر آہ مشرق کی جہالت
کہ مدتوں اس کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ یونان مشرق نہیں ہے
مغرب ہے -

اس سطحی النظری اور تنگ دلی کے سبب مشرق مغرب کے
مقابلے میں طفل دبستان ہو کر رہ گیا مگر اس کا یہ غرور آج بھی
دھندلے دھبے کی حد تک باقی ہے کہ ہم علم میں مغرب سے بہتر
نہیں ہیں تو کم تر بھی نہیں ہیں -

(۹) مغرب میں مُردہ پرستی اور ماضی پرستندگی نہیں ہے - زندہ
پروری اور حال نوازی ہے - وہ گذرے لوگوں کو پوجتے نہیں،
نہ گذرے زمانہ کو پوجتے ، وہ گذرے ہوؤں کی یاد ضرور
کرتے ہیں اور اتنا کرتے ہیں کہ ان کی یادگاریں کھڑی کر
دیتے ہیں ، حتٰی کہ مجسمے بنا ڈالتے ہیں لیکن ان کے وظیفے
نہیں پڑھتے، نہ ان کے ناموں کی دھونیاں رما بیٹھتے ہیں ، نہ
ایسا کرتے ہیں کہ ان کی خاطر زندوں کو ٹھکرا دیں یا نیچا
دکھائیں یا ان کی طرف سے منہ پھیر لیں اور ان کو بے یار و

مددگار چھوڑ دیں، بلکہ ان کی طرف زیادہ دوڑتے ہیں، ان کے
گرد زیادہ حلقے باندھتے ہیں ، ان کی طرف زیادہ تاکتے ہیں،
یہ اس لیے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ ہی میں زیادہ طاقت
ہوتی ہے -

پھر وہ اگلوں اور موجودوں کے کارناموں کے بے لاگ مقابلے
کرتے ہیں اور اگر موجودوں کے کارناموں میں کوئی واقعی بڑھوتری
ہے تو وہ بلا تردد ان کو گلوں پر بڑھا بھی دیتے ہیں اور اتنا ضرور
ہی کرتے ہیں کہ زندوں کو آگے چلاتے رہتے ہیں اور انھیں کے پیچھے
چلنے لگتے ہیں، چاہے وہ مُردوں سے کچھ گھٹیا بھی ہوں ، پھر ان
کو اپنی مددوں سے مُردوں کے برابر پہنچا دینے کے یا آگے بڑھا دینے
کے حوصلے بھی کرتے ہیں مگر یہ بیہودگی بھی نہیں آنے دیتے کہ
اگلوں کا حق مار بیٹھیں - بہرحال ان کے ہمیشہ اصلی رابطے زندوں
ہی سے قائم ہوتے ہیں اور مُردوں سے صرف اتنا جتنا ضرورت چاہے،
نہ یہ کہ مبالغے کریں اور غلو برتیں، یہاں تک کہ زندے مُردے
ہو جائیں -

مشرق مُردہ پرست ہے ، یہاں زندے حقیر ہیں اور مُردے
عظیم، نتیجہ یہ کہ زندگی ہر آنے والی منزل میں صرف دم توڑنے
کے لیے ہوتی ہے اور موت تسلّط بڑھانے کے لیے- نتیجہ ہر نئی منزل
میں صرف زوال نکلتا ہے - مُردے آخر کہاں تک سہارے دیں، ان
کے گذرے ہوئے کارنامے محض ذکر و تذکرہ سے کہاں تک زندگی
کی طاقت دکھائیں ، زندے چاہتے ہیں کہ زندگی کے جوہر اور طاقت
کے کرشمے دکھائیں مگر انھیں ابھرنے نہیں دیا جاتا ، انھیں دبا دیا

جاتا ہے اور صرف اس جرم میں کہ کیوں زندہ ہیں اور کیوں زندگی
ہی میں ابھار اور نکھار کے حوصلے کرتے ہیں اور کیوں مر چکنے کا
صابرانہ انتظار نہیں کرتے ، انھیں سزا دی جاتی ہے اور سخت سزا ،
یہاں تک کہ وہ جلدی مر لیتے ہیں ، البتہ جب مر لیتے ہیں جب ان
کے جوہروں کی یاد کی جاتی ہے اور ان پر آنسو بہانے کا اہتمام کیا
جاتا ہے لیکن اب یاد بھی بے کار ہوتی ہے اور اشک ریزی بھی
رائیگاں ٹھہرتی ہے ۔

(۱۰) مغرب میں ترتیب اور تنظیم اور احاطگی اور جمعگی ہے ۔ وہاں
ایک مسئلہ پر اگر ایک درجن متضاد خیالات ابل پڑتے ہیں
تو یہ نہیں کہ ایک کے سوا بقیہ گیارہ رد کر دیے جائیں ۔
پورے کے پورے ایک درجن جیب و کیسے میں رکھ لیے
جاتے ہیں ۔ کیا یہ جاتا ہے کہ زیرِ بحث مسئلے کے
ایک درجن مختلف پہلو غور و فکر کی طاقت سے نکال لیے
جاتے ہیں اور ایک ایک پہلو کی روشنی میں ایک ایک
خیال کو رکھ کر اس کی تصدیق کر دی جاتی ہے ۔
چلیے درجن کے درجن آپس میں ٹکراتے ہوئے خیالات فکر کے
مرقع میں اپنی اپنی جگہ موزوں بیٹھ جاتے ہیں ۔ پھر ان
سب خیالات کو مختلف پہلوؤں سے بے تکلف برتا جاتا ہے
اور ہر ایک سے نفع اٹھایا جاتا ہے ، یوں ان کا علم بھی
احاطگی اور جمعیگی رکھنے والا بن جاتا ہے اور عمل بھی
پوری وسعت اور عمل کا پھل پوری قوت پا جاتا ہے ۔ اس
طریقے سے زندگی وسیع، محیط ، مرتّب ، منظّم اور طاقتور بن

جاتی ہے -

مشرق اس جوہر کا بھی دشمن ہے - اس کے یہاں اختلاط اور جمعیت کی جگہ ضیقگی اور یک طرفگی ہے - یہاں ایک مسئلے پر صرف ایک خیال کی سمائی ہے جہاں دو متضاد خیالوں نے سر نکالا ان میں سے ایک پر جوتے پڑنے لگے - جوتے نہ سہی کھڑاویں سہی - پھر ایک خیال صاحب ہی نہیں بلکہ دوسرے خیال صاحب بھی اس زد میں آ جاتے ہیں ، وہ اس طرح کہ ایک خیال کے ماننے والوں نے دوسرے خیال کی پٹائی شروع کی تو دوسرے خیال کے ماننے والوں نے جواب میں پہلے خیال والوں کی کٹائی کا ثواب کمانا شروع کر دیا۔ یوں دونوں خیال حضرات مار پیٹ کے نرغے میں آ جاتے ہیں - پھر جہاں ضیقگی اور ایک طرفگی ہے وہاں ترتیب اور تنظیم کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے - یوں مشرق میں فکر اور علم کے میدان میں صرف تفرقوں اور جھگڑوں کی سلطنت قائم ہو جاتی ہے اور اس سلطنت کے زندگی کُش سائے میں زندگی جلد دم توڑ دیتی ہے اور جھٹ سے موت کی گود میں پہنچ جاتی ہے - پھر طُرفہ یہ کہ تفرقوں اور جھگڑوں کی یہ منحوس سلطنت غریب مرحوم زندگی کا پیچھا اس کے قبر میں پہنچ جانے کے بعد نہیں چھوڑتی - اب اس کے قبر پر ڈنڈے برساتی ہے اور اس احتیاط سے کہ شاید خبیث زندگی کہیں قبر میں بھی چرائی ہوئی سانسیں برآمد نہ کر رہی ہو ، پھر دوسرا طرفہ یہ بھی ہے کہ جب زندگی کے بالکل مر لینے کا یقین ہو لیتا ہے تب اس کا ماتم بھی شروع ہو جاتا ہے اور اس کے شاندار مقبرے بنا کر اس پر شان دار عرس بھی قائم ہو جاتا ہے - مشرق کی یہ جان اُوا ریت دیکھ

کر کبھی تو خود میرے کلیجے سے بھی یہ آہ اٹھنے لگتی ہے کہ ہائے میں مشرق میں کیوں جنم لیوا ہوا ۔ پھر اگر یہ غلطی ہو بھی گئی تب بھی یہ کیوں ہوا کہ مشرق کی خونخوار خاک ہی سے لپٹے ہوئے پوری عمر گزار دی اور یہ نہ ہوا کہ مشرق کے دوزخ سے بھاگ کر مغرب کی بہشت میں جا لیتا اور وہاں مشرق میں جنم لینے کے نقصانات کی کچھ تو تلافی کر لیتا ۔

(۱۱) مغرب میں صغیر پروری کا بھی زبردست جوہر موجود ہے ۔ بیچارے مشرق کا دامن اس جوہر کے موتی سے بالکل خالی ہے ۔ اس موتی کی جگہ اس کے دامن میں کبیر پرستی کا کنکر موجود ہے ۔ مغرب یہ عالی ظرفی اور اعلیٰ شرافتکی رکھتا ہے کہ وہ چھوٹوں کو ہر طرح پالتا ہے اور ہر طرح بڑھاتا ہے ۔ وہ چھوٹوں کے جوہر کو پرکھتا ہے ۔ چھوٹوں کے جوہر کی حفاظت کرتا ہے ۔ چھوٹوں کے جوہر کو اچھالتا ہے اور چمکاتا ہے اور یوں چھوٹوں کو بڑا بنا دیتا ہے ، پھر اس کارنامے پر فخر نہیں کرتا ۔ یہ مانتا ہے کہ یہ کام ایک فرض تھا جس کا ادا نہ کرنا جرم تھا اور اس کا ادا کرنا احسان نہیں ۔ چھوٹوں میں بچے، غریب، بوڑھے، عورت ، جاہل اور مظلوم بھی شامل ہیں ۔ مغرب میں جوہر ہونا چاہیے ، پھر اس کا ابھارا اور نکھار کیا مجال کہ رہ جائے ۔ مغرب میں چھوٹے کو عمر بھر اس بات پر رونا نہیں ہے کہ وہ چھوٹا ہے، نہ اس کو یہ طے کر لینا ہے کہ چونکہ وہ چھوٹا ہی پیدا ہوا ہے ، اس لیے اس کو عمر بھر چھوٹا ہی

رہنا ہوگا ۔ مغرب کا خدا جیتا جاگتا رب العالمین ہے ۔

مشرق میں صغیر پروری کی جگہ کبیر پرستی ہے ۔ مشرق میں چھوٹے مار کھاتے ہیں ، ٹھکرائے جاتے ہیں ، روندے جاتے ہیں ، دھول بنا دیے جاتے ہیں ، پھر اس بات پر فخر بھی کیا جاتا ہے ۔ فخر کیوں ؟ فخر یوں کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ ذلیلوں کو ہمیشہ ذلیل رکھا جائے اور انہیں ذلیل کر کے خوش ہوا جائے ۔ مشرق میں بڑوں کی پرستش کی جاتی ہے، بڑوں کے راگ گائے جاتے ہیں ، بڑے کے پاؤں چومے جاتے ہیں ، بڑوں کو کندھوں پر چڑھایا جاتا ہے ، بے جوہر بڑے جوہر دار ٹھہرائے جاتے ہیں اور ان کے پیتل کو مانجھ مانجھ کر خالص سونا ٹھہرا دینے کی کوشش کی جاتی ہے ، بڑوں کو معصوم بنا دیا جاتا ہے پھر اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے ، یہ سمجھ کر کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ بڑے کو زیادہ بڑا بنایا جائے یہاں تک کہ بندگی سے خدائی تک پہنچا دیا جائے ۔

(۱۲) مغرب میں مذہبیت اعتدال کے اندر ہے ۔ مغرب مذہبیت کو ایک خاص حد میں رکھتا ہے اور اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا ۔ مغرب میں دو آنہ مذہبیت ہے چودہ آنہ تہذیب ، صرف دو آنہ میں خدا کا خیال، دنیا کا خیال، مادیت کا خیال ، عقلیت یعنی ظاہریت کا خیال ۔ اس اعتدال نے مغرب کو جوگڑاالقندرہ اور غلمٹا ہونے سے بچا رکھا ہے ۔

مشرق میں مذہبیت بے اعتدالی کی حد تک ہے ۔ چودہ آنے مذہبیت ہے دو آنہ تہذیب ہے ۔ صرف دو آنہ میں مخلوق کا خیال، دنیا

کا خیال ، مادیّت کا خیال، عقلیّت کا خیال ہے یعنی ظاہریّت کا خیال ہے، باقی چودہ آنہ کے چودہ آنہ باطنیّت کے خیال کے لیے وقف ہے ۔ اس بے اعتدالی نے بھی مشرق کو جوکڑ القندرہ اور غلمٹا بنا ڈالا ہے اور رکھنے والا ہے جب تک وہ خود مشرق کے سر پر سوار رہ سکے ۔

(۱۳) مغرب مکمل منظم زندگی والا خطہ ہے جہاں کبھی ایک تنکا اور ایک پتّہ بھی ابتری کی حالت میں نہیں رہ سکتا اور غلط جگہ نہیں ٹھہر سکتا ۔ جہاں بڑی سے بڑی بھیڑ میں بھی ایک آدمی کا کندھا دوسرے آدمی کے کندھے سے رگڑ نہیں کھا سکتا ۔ جہاں عیش و عشرت کی بدمستی اور عشق و الفت کو جنون پرستی بھی اتنی بے لگام نہیں ہو سکتی کہ وہ ان کے تمدنی کاروبار کے اندر جھانک لینے کا خیال تک دل میں لے آئے ۔

عیش اپنے وقت ہے ، کاروبار اپنے وقت ۔ عیش اپنی حد میں ہے اور شغل اپنی حد میں ۔ اس عجیب و غریب تنظیم نے اس کی زندگی کو معجزہ نہیں تو جادو تو بنا ہی دیا ہے ، مشرق غریب تو مغرب کو پہچان بھی نہیں سکتا کوشش کے بعد نہیں پہچان سکتا ۔ اس لیے بھی مشرق مغرب کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح یا زیادہ سے زیادہ قلندر کے بندر کی طرح ہو چکا ہے ۔ مغرب مشرق کو صدیوں سے کھلا رہا ہے اور نچا رہا ہے ، مشرق کھیل رہا ہے اور ناچ رہا ہے ۔ جی چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو ۔

مشرق مکمل غیر منظم زندگی کا خطہ ہے ۔ یہاں جنالوں اور

فرشتوں تک کو غیر منظم ہو کر رہنا پڑتا ہے - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ستارے یہاں پہنچ کر اپنی طبعی گردش میں خود گڑ بڑ کر لیتے ہوں - یہاں کی بدنظمی کو سمجھنے میں شاید یہ مقولہ مثل کا کام دے "یہاں عیش ہے تو جیش نہیں اور جیش نہیں ہے تو عیش نہیں" اسی طرح یہاں عشق ہے تو عقل نہیں اور عقل ہو تو عشق نہیں - یہاں سوتے ہیں تو جاگتے نہیں اور اگر جاگتے ہیں تو سوتے نہیں - پھر یہ بھی کہ سونے کے وقت جاگیں گے اور جاگنے کے وقت سوئیں گے ، پھر کتاب خانے میں ، باورچی خانے کو بھی تم دیکھ سکتے ہو اور باورچی خانے میں کتاب خانہ بھی نظر آ سکتا ہے - مشرق یہاں تک نہیں جان سکا ہے تنظیم فلاں چیز ہے اور ضروری چیز ہے - مشرق یہ بھی نہیں جانتا کہ اگر تنظیم ضروری ہے تو کیوں ضروری ہے -

(۱۴) مغرب بڑا ہی عاشق فطرت بھی ہے - اس کی عاشقی فطرت اتنی گہری ہے کہ فطرت سے ملنے کے لیے وقت اور زندگی دونوں کو بے دریغ قربان کر دیتا ہے اسی لیے فطرت بھی اس پر اتنی مہربان ہے کہ جتنی نعمتیں فطرت کے پاس ہیں ان سب کی کنجی اس نے مغرب کے حوالے کر دی ہے یہ کہہ کر کہ یہ ساری نعمتیں تیری بھی ہیں جیسی کہ میری ہیں - دیکھتے ہو ، اس شوق میں کہ ہمالیہ کو ایورسٹ چوٹی پر پیدل پہنچ کر اسے گلے لگانا چاہیے تاکہ حق عاشقی بھی ادا ہو ، ایورسٹ کی قربان گاہ پر دھڑا دھڑ قربانیاں دے رہے ہیں ، ورنہ ہوائی جہاز سے وہاں پہنچ جانا اور اس کا منہ چوم لینا

کتنی بڑی بات تھی ۔ اس سے پہلے اور اس کے علاوہ بھی خدا جانے فطرت کی قربان گاہ حسن پر کہاں کہاں کیسی کیسی قربانیاں دے چکے ہیں اور دیتے رہتے ہیں اور دیتے رہیں گے ۔

مشرق کو فطرت سے کوئی دلچسپی نہیں وہ انوارِ باطنی کی سیریں کر کے یا پھر مہوے یا جو کی شراب اور تاڑ یا کھجور کی تاڑی کے چکڑ چڑھا چڑھا کر یا پھر گانجا اور چرس کے دم لگا لگا کر سر مست یا بدمست ہو لینا پسند کرتا ہے اور ان راہوں میں مر لینے کی بھی ہمت کر لیتا ہے لیکن نہیں کر سکتا تو یہ کہ ہمالیہ کی کسی نئی چوٹی پر پہنچنے کے شوق میں یا سورج کے طلوع کے میدانی یا ساحلی یا کوہی منظر کو دیکھنے کے لیے صرف گھنٹہ بھر کے واسطے کوٹھری کی گھاٹ یا حجرے کی چٹائی چھوڑ دینے کی بھی قربانی دے ڈالے ۔

مشرق اس لاابالیت کی سزا بھی پا رہا ہے ۔ اس نے فطرت کو ٹھکرایا تو فطرت نے اس کو بھی ٹھکرایا اور جب فطرت نے اس کو ٹھکرا دیا تو خدا نے بھی ٹھکرا دیا ۔ جہاں تک زندگی کی ظاہری ضروری نعمتوں کا تعلق تھا ۔ چنانچہ زمین نے اپنی قیمتی کانیں نہیں دیں ، پانی نے اپنے قیمتی جواہرات نہیں دئیے ۔ ہوا نے اپنا قیمتی پانی نہیں دیا ۔ فضا نے اپنی قیمتی ہوائیں نہیں دیں ۔ ایتھر نے قیمتی فضا نہیں دی ، مشرق بھک منگا ہو کر رہ گیا ۔ پھر جوگڑا بن گیا ۔ لقندرہ بن گیا ۔ اور آخر میں غلمٹا بن گیا، پھر ہر وہ چیز بن گیا جو بننے کے لائق نہیں تھی ۔ پھر طرہ یہ کہ مشرق کو خدا اور حقیقت بھی نہیں ملی، جن کے نام پر اس نے فطرت کو مع اس کی نعمتوں کے

ٹھکرایا تھا ۔ پھر وہ کوٹھریوں ، اور ٹھیکیوں کا عیش بھی زیادہ نہ ساتھ دے سکا، جس پر فطرت کی سیر کو قربان کیا تھا، کیونکہ جب مغرب اپنی شاہ خرچ زندگی کو دنیا بھر کے لیے اونچی زندگی کا معیار بناتا ہوا دنیا پر چھا گیا تب مشرق کو بھی سر جھکا دینا پڑا لیکن جب اونچی زندگی کو قائم کرنے چلا تو اس کے روٹی کپڑے ہی میں سارے پیسے خرچ ہو گئے ۔ تو پھر شراب اور لبیذ کے لیے پیسے کہاں سے آئے ؟

(۱۵) مغرب کی ان خصوصیتوں کا، جنھیں ہمیں یہاں بتانا ہے اب آخری شمارہ آ پہنچا ۔ مغرب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ درجۂ اول کا مومن متّقی فیلسوف ہے ۔ مغرب کی فیلسوفیّت تو خیر اتنی روشن ہے کہ اندھے اور پاگل بھی اس کو جھٹلا نہیں سکتے۔ اس کی فیلسوفیّت ہی کے تو پر ہیں جن پر سوار ہو کر آدمیوں کی پوری دنیا آسمان کی طرف اڑی چلی جا رہی ہے ۔ اس کی ایجادوں سے کس کو تعلق نہیں ہے ۔ کون فائدہ نہیں اٹھاتا، وہ بھی جو غصے یا ضد یا تقویٰ کے ہیضے کے مارے ریل تک پر نہ چڑھنے کی قسم کھا چکے ہیں اور شہروں میں آنے سے بھی توبہ فرما چکے ہیں کہ نہ شیطان کا ہوں میں جائیں گے نہ شیطانوں کی ایجادوں سے مڈبھیڑ ہوگی ۔ گاؤں میں جھونپڑوں میں بیٹھ کر دیا سلائی مغرب ہی کی استعمال کرتے ہیں ۔ سوئی مغرب ہی کی صرف میں لاتے ہیں اور چولھے چکی ، گوبر ، مٹی کے سوا کونسی استعمال کی چیز ہے جس کو مغرب ہی کی طفیل میں استعمال نہیں کرتے ۔

البتہ مغرب کا مومن اور متّقی ہونا اور درجہ اول کا مومن متّقی ہونا ذرا سمجھانے کی چیز ہے تو لیجیے اس کو بھی سمجھ لیجیے - مومن اور درجہ اول کا مومن کون ہے وہ جو ہر معلوم ہو جانے والی چیز ، چاہے وہ کتنی ہی نئی ہو اور معمولی عقل اور معمولی علم کے لیے کتنی ہی عجیب ہو اور پرانے عقیدہ سے کتنی ہی ٹکرانے والی ہو ، پر ضرور ایمان لائے یعنی اس کو مان لے کہ وہ ہے اور حق ہے اور ایسے مانتے ہیں اگر پرانے عقیدے کو قربان کر دینا پڑے تو بلا تکلف پرانے سے پرانے عقیدے کو بھی قربان کر ڈالے یعنی یہ مان لے کہ پرانا عقیدہ غلط تھا اور اب ہم اس کو چھوڑتے ہیں اور اگر اس نئی چیز کو ماننے میں اتنی مخالفت بھی اٹھانی پڑے کہ جان جیسی شے بھی چلی جائے تو چلی جانے دے - آخر شروع شروع کے مسلمانوں کو مومن کہا گیا تھا - اسی لیے تو کہ جب توحید ،حضرت الوہیت اور رسالت حضرت محدیت کے نئے مسئلے ان کے سامنے آئے ، جو ایسے تھے کہ عقیدۂ شرک اور رسالت موسوی اور رسالت عیسوی کے خاتم الرسالت کے عقیدے کی رو سے عجیب بھی تھے اور ان تینوں عقیدوں کے مخالف بھی تھے لیکن تب مسلمانوں نے ان نئے عجیب مخالف عقاید ثلاثہ عقیدوں کو مانا اور اپنے پرانے عقیدوں کو طلاق دے دی، پھر اس نئی مان کی راہ میں جانوں تک کی قربانیاں بھی پیش کر دیں -

مغرب میں بھی یہ جوہر اور یہ عمل موجود ہے اس کو جو نئی چیز حق معلوم ہوئی اس کو ضرور مانا اور اتنا مانا کہ پرانے مانوں کو چھوڑ دیا - پھر اس نئے مان سے اتنا چمٹے کہ جان کا ڈر بھی اس

سے ان کو الگ نہ کر سکا ۔ تب مغرب ضرور مومن ہے اور درجہ
اول کا مومن ہے ۔ تقویٰ کیا چیز ہے اور درجہ اول کا تقویٰ کیا چیز
ہے ۔ تقویٰ ہے حق پرستی ۔ درجہ اول کا تقویٰ درجہ اول کی حق
پرستی ہے ۔ مغرب حق پرست اور اول درجہ کا حق پرست بھی ہے
جیسا کہ مومن اور درجہ اول کا مومن ہے ۔ مغرب کی حق پرستی اور
اول درجہ کی حق پرستی کا ایک موٹا ثبوت تو یہی ہے کہ اس نے اس
زور کی ترقی کی کہ فرشتے اور شیطان تک دُھل گئے اور انسان تو پاگل
ہو گیا، کیا اتنی ترقی اور زور دار ترقی حق پرستی اور اول درجہ کی
حق پرستی کے بغیر ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی، زوال کو اللہ نے اپنا
عذاب فرمایا ہے اور ترقی کو اپنا انعام ٹھہرایا ہے، انعام حق پرستی
کے بغیر کیونکر ممکن ہے، کیا ناحق پرست بھی اللہ کا انعام پا سکتے
ہیں ۔ اگر ناحق پرست بھی اللہ کا انعام پا سکتے ہیں تب حق پرست
اور ناحق پرست صلے میں برابر ٹھہریں گے، تب ناحق پرستی بڑی چیز
کیسے ٹھہرے گی ۔ حالانکہ ناحق پرستی بری چیز ٹھہرائی جا چکی ہے
تب ترقی حق پرستی کے بغیر نہیں مل، سکتی ناحق پرستی کے لیے
ترقی ناممکن اور زوال لازمی ۔ تب مغرب ضرور حق پرست ہے اور
اول درجہ کا حق پرست ہے کیونکہ اس نے اول درجے کی ترقی کی
اور جب حق پرست اور اول درجہ کا حق پرست ہے تب مغرب متّقی
اور اول درجہ کا متّقی بھی ہے اور جو ایسا ہوتا ہے وہ اول درجہ کا
مجاہد بھی ہوتا ہے، تب مغرب مجاہد بھی ضرور ہے اس اصول کی رو
سے بھی اور واقعے کی رو سے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ الدھے بھی دیکھتے ہیں
اور پاگل بھی سمجھتے ہیں کہ مغرب لگا تار مجاہدے میں لگا تار ڈوبا
ہوا ہے ۔ اس کا ہر گروہ مجاہدہ کر رہا ہے، اس کا ہر فرد مجاہدہ کر

رہا ہے ۔ صفائی کا مجاہدہ کر رہا ہے ۔ تاجری کا مجاہدہ کر رہا ہے ۔ ایجاد کا مجاہدہ کر رہا ہے ۔ انکشاف کا مجاہدہ کر رہا ہے ۔ تعلیم ، تنظیم اور تقدیم کے مجاہدے کر رہا ہے، جنگ و جدال کے مجاہدے کر رہا ہے اور کونسا مجاہدہ ہے جو نہیں کر رہا ہے ۔ شاید کوئی کہے کہ عبادت اور روحانیت والا مجاہدہ تو نہیں کر رہا ہے تو بتا دیا جاتا ہے کہ وہ یہ مجاہدہ بھی کر رہا ہے ۔ پڑھو مغرب کے لئے صوفیوں کا حال اور روحانیوں کا حال جو اس دور میں تھیاسوفسٹ اور اکلٹسٹ کہلاتے ہیں اور تعجب کر کر اٹھو کہ : غ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مشرق نہ فیلسوف ہے نہ مومن ، نہ متّقی اس لیے کہ وہ علم ہی میں اعلیٰ ہے نہ نئی دریافتوں اور گہری حقیقتوں کے ماننے ہی پر تیار رہتا ہے نہ حق پرستی ہی کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے اس کے زوال کی اور جب تک صلاحیت اور صالحیت کے ان چاروں بنیادی جوہروں سے خالی بیٹھا رہے گا زوال سے چھوٹ نہیں سکے گا ۔ کیا کیجیے خدا کا قانون بھی یہی ہے جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ فطرت اور قدرت کا قانون بھی یہی ہے ۔

عیب اور دور کا ماضی

بے عیب ذات خدا کی ہے ۔ میں نے جو یہ کہا کہ مغرب میں یہ ہنر، یہ ہنر، یہ ہنر تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مغرب میں کوئی عیب نہیں ۔ عیب مغرب میں بھی ہے اور کافی ہے ۔ اگر عیب نہ ہوتے

تو زبردست ہنروں اور چکا چوند پیدا کر دینے والی ترقیوں کے ہوتے ہوئے بھی دنیا اس کو پیار کیوں نہ کرتی اور یہ واقعہ ہے کہ پیار نہیں کرتی، پھر اتنا ہی نہیں کہ پیار نہیں کرتی، نفرت بھی کرتی ہے۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ دنیا مغرب کو سجدہ کرتی لیکن اچھا ہی ہوا کہ مغرب عیب والا بھی رہ گیا، نہیں تو واقعی پوری دنیا مغرب کو سجدہ کرنے لگتی اور مشرک ہو جاتی۔

مغربی عیبوں کو میں نے اپنی اپنی آنکھوں دیکھا ہے اور عامیانہ نگاہوں کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ نگاہوں سے بھی دیکھا ہے۔ خوب خوب عیب بھی ہیں جیسے کہ خوب خوب ہنر بھی ہیں، لیکن مغرب کے عیبوں کو بھی بتا دیا جائے یا نہ بتایا جائے یہ بات میرے لیے ہمیشہ تردّد کی بات رہی ہے، لیکن آج بھی فیصلہ ہے کہ نہ بتایا جائے۔ میرے سفر نامے کا مقصد سفر گوئی نہیں ہے بلکہ حشر انگیزی ہے۔ سفر نامہ یہ چاہتا ہے کہ مشرق میں جوش و خروش کا حشر اٹھ کھڑا ہو۔ جس حشر کے ہاتھ سے مشرق ترقی کی ایک نئی زندگی پا لے اور جس طرح مغرب کو نشاۃ ثانیہ (دوسری ابھار والی زندگی) مل گیا ہے، مشرق کو بھی نشاۃ ثانیہ مل جائے۔ بھلا یہ مقصد مغرب کے عیوب گنوانے کے بعد بھی حاصل ہو سکتا ہے، نہیں حاصل ہو سکتا۔ لیکن اتنا سن کر کہ مغرب عیب دار بھی ہے، مقصد میں تو کچھ خلل آ ہی گیا، مگر کیا کیجیے اتنی بات کی تو مجبوری تھی۔ آخیر کی فیصلہ کرنے والی بات بھی اس بحث کے بارے میں سن لیجیے۔ وہ بات یہ ہے کہ مغرب بھی اس مشرق کی طرح عیب دار ہے مگر مغرب کی بڑائی مشرق پر یہ ہے کہ مغرب کے

ہنر کا پلہ مغرب کے عیب کے پلے پر بھاری ہے اور بہت بھاری ہے
مغرب میں عیب فقط ایک آنہ ہے ، ہنر پندرہ آنے مشرق میں عیب
پندرہ آنے ہے ، ہنر ایک آنہ ۔

ذرا یہ فرق تو دیکھ اے نظر کہاں تک ہے ؟

پھر مغرب کی مدّاحی کا یہ مطالب بھی نہ تھا کہ مغرب ہمیشہ
سے ایسا ہی دودھ کا دھلا اور سونے میں تلا چلا آ رہا ہے ۔ مغرب
کا دور کا ماضی کس کافی پڑھے لکھے کو نہیں معلوم ہے اور یہ
نہیں معلوم ہے کہ وہ بہت ہی گھناؤنا تھا ۔ عیب ہی عیب کیڑے
ہی کیڑے ، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ یہ زمانہ مشرق کے ہنر کا زمانہ
تھا اور اتنے ہنر کا زمانہ کہ بس ہنر ہی ہنر اور خوبی ہی خوبی
لیکن اس کو کیا کیجیے ۔ ع

تم کچھ نہیں تو بابا یہ سب کہانیاں ہیں

پھر یہ کہ مشرق کو اتنی سی بات پر کہ مغرب بھی تمہاری ہی
طرح گھورے کا چتھیڑا تھا، مغرب پر طعن کا حق کہاں سے پہنچتا ہے؟
یہ ماجرا تو مغرب کے مزید لائق تحسین ہونے کا ایک سامان ہے ۔
یہ ماجرا تو یہ دکھاتا ہے کہ مغرب معمولی بڑی چیز نہیں ہے ۔
غیر معمولی بڑی چیز ہے ۔ مغرب اتنی بڑی چیز کو گھورے کا چتھیڑا
ہوتے ہوئے بھی اتنا بڑھا اتنا بڑھا کہ ایتھر کی چادر بن گیا جس کی
برکت اور بڑائی سے اب زمین کا ایک چپہ بھی خالی نہیں ، پھر یہی
ماجرا مشرق کی غیر معمولی چھوٹائی کا ثبوت بھی مہیا کر رہا ہے ۔
مشرق پہلے اتنا بڑا تھا مگر اتنا بڑا ہو کر بھی اتنا گھٹا کہ

زیرِ زمین بسنے والے گندے نالوں کا زیرِ زمین پانی ہو کر رہ گیا ۔
اللہ اکبر :

صلاحِ کار کہاں اور میں خانہ خراب کہاں ؟

پھر یہ مشرق کا یہ فخر بھی طفلانہ ہے کہ دور کے ماضی میں ہم ہی مغرب کے استاد تھے ۔ مغرب نے جو سیکھا عربوں سے سیکھا جو مشرق ہیں ، مغرب کو خود اس کی استادی سے ہرگز انکار نہیں ، بلکہ اس پر اصرار ہے اور اس کا اظہار اور مسلسل اظہار ہے ، مگر حضرت مشرق کاش آپ میں اپنی ہی پرانی عقل کا کوئی ریزہ بچ رہا ہوتا اور اگر وہ ہے تو اسے کاش آپ اس کو خرچ کرنے کی تھوڑی سی زحمت اٹھاتے ، کاش آپ یہ سمجھتے کہ وہ بھکاری جو عین بھیک مانگتے وقت یہ پکار بھی لگائے جا رہا ہو کہ ہم بھی کبھی دولت والے تھے اور ایسے دولت والے تھے کہ آج ہم جس کو اپنا داتا بنانا چاہتے ہیں یہ کبھی ہماری ڈیوڑھی کا مستقل خیرات خور تھا ، درحقیقت اپنی انتہائی ذلّت کا اعلان کر رہا ہے ساتھ ہی ساتھ اپنے داتا کی ہمدردی دھو رہا ہے ۔ (سفر نامۂ ربّانی : ۱۱۷-۱۲۵) ۔

یہاں ایک گرہ کا کھول دینا بھی ضروری ہے جو میرے اوپر کے کلام سے پڑ سکتی ہے ۔ میں نہ انگلستان یا انگریز کا مخالف ہوں نہ روس اور روسی کا عاشق ہوں، کیونکہ میں تو ربّانی ہونے کی وجہ سے عالمی شخص ہوں ، میری نظر میں انگلستان اور روس اور انگریز اور روسی کی برابر کی قیمت ہے ۔ ان میں سے جو ترقی کرے اس سے خوش ہوں اور جو انسانیت کو فائدہ پہنچائے اس کے لیے میری

دعا ہے ۔ مجھے اشتراکیت یعنی کمیونزم سے دلچسپی ضرور ہے و ہمدردی بھی ہے، اس کی تھوڑی سی خدمت بھی کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہنا چاہتا ہوں یہ سمجھ کر کہ وہ ایک نیم ربانی چیز ہے، اس کی ترقی عین ربانیت کی ترقی ہے اور عین انسانیت کی ترقی ہے، لیکن میری دل چسپی اس سے اتنی مجنونانہ یا اعتقادیانہ نہیں ہے کہ اگر کبھی وہ مرنے ہی پر تُل جائے تو میں اس کی لاش سے لپٹ کر زندگی کاٹ دینے یا سوگ میں جان دے دینے کا عہد کر لوں ۔ میری اس درجے کی دلچسپی کی چیز صرف میری اپنی تحریک تحریک ربانیت ہے اور بس (سفر نامۂ ربانی - ۱۵۹:۱۵۸) -

فوائدِ سیاحت

اس سیاحت سے مجھے تو یقیناً فائدہ پہنچا ۔ میرے بہتیرے اندھیرے دور ہوگئے ، میرے بہتیرے دھندلکے چھٹ گئے ۔ میرا علم بڑھ گیا ۔ میری قوت تیز ہوگئی ، میری ہمت میں پکا پن آ گیا ۔ میری مستعدی دو چند ہو رہی ۔ میری وسعت اور زیادہ پھیلی ۔ میری مدافعت اور زیادہ جڑیلی ہوئی ۔ میرا ایمان چمک اٹھا ، میری عقل دمک اٹھی ، میری فکر گہری بن گئی ، میرا تجربہ گاڑھا ہو گیا ۔ میں پہلے صرف نقطہ تھا ، اب دائرہ بن گیا ۔ میں روحانی دنیا میں یعنی مشرق میں ۱۹ حصے مادّی تھا صرف ایک حصہ روحانی ۔ مغرب کی مادّی دنیا میں پہنچ کر میں ۱۹ حصے روحانی ہو گیا ، صرف ایک حصہ مادّی رہ گیا ۔ میری عقل سے یہ بڑا دھوکہ چھٹا کہ میں جس کو (مشرق کو) روحانی سمجھتا تھا ، مادّی تھا اور جس کو (مغرب کو) مادّی جانتا تھا روحانی نکلا ۔

میری نفرت محبت بن گئی ، میری وحشت السیت ہو گئی ، میری تقلید نے تحقیق کا رنگ پکڑ لیا ۔ میری تحقیق میں تقلید کی جھلک آ گئی ۔ زندگی کے آدھے ادھ کھلے معنی یہاں کھلے وہ آدھے جو مشرق میں نہیں کھلے تھے ، موت کے بھی پورے معنی یہیں سمجھ میں آئے ۔

فخر ٹوٹ گیا ، گھمنڈ جاتا رہا ، معلوم ہوا یہاں افلاطون بھی بچہ ہے اور ارسطو بھی طفیلی سے زیادہ نہیں ۔ اگرچہ یہاں کی روشنی نکلی ہے افلاطون اور ارسطو ہی کے جلائے ہوئے چراغوں سے مگر چراغ اب بجھ چکے اور ان کی جگہیں بجلیوں نے لے لیں ۔

میرے ولولے تیز اور حوصلے طرار ہو گئے ، معلوم ہوا کہ یہاں جنگلی اور پاگل بھی سیکھ سکتے ہیں اور کھنکھڑ بڑھے ہی نہیں مُردے بھی دوڑ سکتے ہیں ۔ میری بے چینی چین اور نا امیدی امید سے بدل گئی ۔ معلوم ہوا کہ جو نہیں ہو سکتا وہ بھی ہو سکتا ہے اور جو نہیں سوچا جا سکتا وہ بھی سوچا جا سکتا ہے ۔

دین کو روشنی میں یہیں سمجھا، پہلے صرف تاریکی میں سمجھا تھا ۔ عمل کی بھی چمکتی ہوئی شکل یہیں دیکھی، ورنہ صرف دھندلی شکلیں دیکھا کرتا تھا ، ایک بڑی بات یہ ہے کہ یہیں میں نے تقویٰ بھی سیکھا جس کو مقدس مشرق کے کسی گوشے میں نہیں سیکھ سکا تھا ۔

میں نے اپنی اس سیاحت میں کوئی سفارشی خط نہیں لیا ۔ یہ نہیں کہ احسان سے عار تھا بلکہ اس لیے کہ آسان سے عار تھا :

ہمیں آسانی سے دلچسپی نہیں ہے
ہمیں مشکل سے بے ربطی نہیں ہے
(زہورِ رہالیت)

یورپ اور امریکہ میں میری ناسوتی شناسائی کسی سے نہ تھی، اگرچہ ظاہری شناسائی سبھی سے تھی، یہ یوں کہ جب حضرتِ الوہیت کے خانۂ علم ہی میں دنیا تھی ، اس سے باہر نہ تھی تب ہم سب اکٹھے بسا کرتے تھے ، پھر وہیں سے سب چلے - چلے اور بکھرے چاروں طرف، لیکن دنیا اب قیامت سے جس میں چولے ہی بدل جائیں گے اتنی نزدیک ہو چکی ہے کہ دنیا عقبی بنتی جا رہی ہے ، تب شناسائی ہوئی بھی تو کیا ، جس طرح عقبی میں بھائی بھائی کو میاں بیوی کو نہیں پوچھے گا ، مغرب کی دنیا میں خصوصاً جیسا کہ پوری دنیا میں عموماً ایک آشنا ایک آشنا کو نہیں پوچھتا اور مختصراً یوں کیوں نہ کہہ دیجیے کہ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا -

اسی لیے میں نے شناسائیوں کی بھی پروا ہی نہیں کی جیسا کہ سفارشوں کی پرواہ نہیں کی - ان مکڑ جالنیوں میں پھنسنے کا آخر فائدہ ؟ کچھ بھی نہیں ، پرانے کنوؤں کی تلاش کے بدلے آخر نئے کنویں ہی کیوں نہ کھود لیں ؟ اسی طرح دوسروں کی انگلیوں کے سہارے ڈھونڈھنے کے بدلے ہم اپنی کھونٹیاں گاڑ لینے کی تکلیف کیوں نہ گوارہ کر لیں ؟

٭ ٭ ٭

میں نے اس سیاحت میں، جیساکہ ہر سیاحت میں شان بے نیازی ہو ، جو فائدے اٹھائے ہیں کاش لوگ انھیں جانتے اور اسے کاش کہ

سمجھتے بھی - میں اپنی بے نیازی کے طفیل میں سیاحتوں میں بارہا چھوٹے سے بڑا بن بن گیا ہوں اور سیاحت والے ملکوں میں اپنی جدا دنیائیں بنا ڈالی ہیں ، چاہے وہ بعد کو باقی رہی ہوں ، چاہے نہ رہی ہوں -

☆ ☆ ☆

لیکن کیا میری سیاحت کا اصل مقصد بھی پورا ہوا یعنی تکمیل علم حاصل ہوئی ؟ یقیناً پورا ہوا - میرے علم میں ایک کسر تھی ، وہ کسر نکل گئی ، اس کسر کو میں نے سمجھا بھی اسی سیاحت کی بدولت اور نکالا بھی اسی سیاحت کے ہاتھوں - اس سیاحت سے پہلے بھی مجھے کچھ دھندھلا سا دھندھلا سا اندازہ تھا کہ میرا علم کوئی نہ کوئی کسر رکھتا ہے ، مگر یہ اندازہ روشن نہیں تھا روشن ہوا سیاحت کے میدان میں پہنچ کر اور یورپ و امریکہ ہی کی سرزمین میں -

اس کے بعد ہی میرا یہ پرانا عقیدہ پورا پکا ہوگیا کہ علم کے شوقینوں کو بشرطیکہ علم کی تکمیل کا ولولہ بھی میسر ہو ، میدان سیاحت کی بھی گشت کرنی پڑے گی اور سیاحت میں دیار مغرب (یورپ و امریکہ) کی تو ضرور ہی خاک چھاننی ہوگی :

بے میکدے کے شیخ نہ آئے گا علم دین
آئین زندگی کو پکاتا ہے میکدہ

ایک بڑی بات اور اتنی ہی بڑی بات جتنی کہ پچھلی بات ہے کہنے سے رہ گئی ، وہ کیا ؟ وہ یہ کہ میری سیاحت مغرب کا ایک

ہی مقصد نہ تھا یعنی تکمیل علم ! بلکہ ایک دوسرا مقصد بھی تھا۔ وہ کیا ؟ وہ تعلیم علم یعنی یہ کہ میں کچھ سیکھنے ہی نہیں گیا تھا، کچھ سکھانے بھی گیا تھا۔ میں پہنچنے سے پہلے جانتا تھا کہ جس طرح میرا علم بعض رخنے رکھتا ہے، جنھیں خطۂ مغرب ہی کا علم بند کر سکے گا اور جس کے بعد ہی میرا علم مکمل بن سکے گا، اسی طرح مغرب کا علم بھی کچھ فساد لیے ہوئے ہے جسے میرا ہی علم نکال سکے گا اور جس کے بعد ہی مغربی علم اس لائق بن سکے گا کہ اس کی غذا کو بلا تکلف مشرقی دماغ کو کھلا دیا جا سکے ورنہ وہ ہضم نہیں ہو گی۔ مشرق کا دماغ اس کو کھا تو لے گا مگر قے کر ڈالے گا اور قے کے ذریعہ اس کو پوری کی پوری نکال باہر کرے گا اور اس کے کچھ حصے کو بھی جزو بدن نہیں بنائے گا۔ چونکہ میں اس بات کو مغرب پہنچنے سے پہلے ہی جانتا تھا اس لیے یہ احساس بھی میرے ساتھ ساتھ لگا چل رہا تھا کہ سرزمین مغرب میں پہنچ کر مجھ کو مغرب کو کچھ سکھانے کی بھی خدمت انجام دینا پڑے گی جیسا کہ مغرب سے کچھ سیکھنے کی محنت کرنا ہوگی :

کچھ سکھاتے ہو تو کچھ سیکھو بھی تم شیخ حرم
رند بھی واقف اسرار حرم ہیں کچھ نہ کچھ !

(رہور ربّانیت)

تو کیا سیاحت کی یہ دوسری غرض بھی لشانے بیٹھی؟ جی ہاں! بیٹھی اور الحمد للہ کہ بیٹھی۔ یورپ میں تو اس غرض والے کام

کا موقع ہی نہ مل سکا ۔ ملا بھی تو اتنا کم کہ کافی نہ ٹھہرا ، لیکن امریکہ میں جو اب مغرب کا بھی مرکز ہے جیسا کہ مشرق کا ، موقع ملا اور وہاں بفضلہ سکھانے کا کام بھی مقدار موقع کے مطابق ہوا ، چنانچہ امریکہ کے ایک طبقہ کے گروہ نے باقاعدہ سیکھا اور اس نے باقاعدہ شاگردوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا جو امید ہے کہ مدتوں میری سیاحت امریکہ کی ایک یادگار قائم رکھے گا ۔

میری یہ سیاحت پورے ایک سال کا حساب پورا کرانے ختم ہوئی ۔ اسی لیے جب ہندوستان میں دوبارہ قدم رکھا تو اس کی دنیا بدلی ہوئی تھی ۔ گیا تھا پورا غلام چھوڑ کر آیا تو آدھا آزاد تھا ۔ یعنی اسٹیج پر یا یوں کہیے کہ پردے کے باہر آزاد تھا ۔ پردے کے اندر بدستور غلام سہی ۔ پھر گیا تھا تو وہ بے ٹکڑے کے تھا ۔ آیا تو وہ دو ٹکڑوں میں تھا اس کا ایک حصہ اس سے نکل کر ایک جدا ملک بن گیا تھا جس کو پاکستان کہا جاتا ہے ، اللہ اکبر ، کتنا بڑا انقلاب ، پھر ایک ہی انقلاب میں دو انقلاب ؟

میری یہ سیاحت خاصی پر تکلیف بھی تھی لیکن شکر ہے کہ خاصی پر تحصیل بھی تھی ، تکلیفیں بھی بہت اٹھائیں ، اتنی بہت کہ دوسرے اندازہ نہیں کر سکتے ۔ دوسرے تو اتنا ہی خیال کرکے بیٹھ رہیں گے کہ یہ شخص گیا اور لوٹ آیا ۔ لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ کیسے گیا اور کیسے لوٹا ، میری حالت کے لوگ کاش جا کر اور لوٹ کر دیکھتے ۔

لیکن تکلیفوں کے ساتھ ساتھ بہتیری راحتیں بھی کمائیں ، ایسی

راحتیں جنھیں بلا تکلف نعمتیں کہا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض چیزوں کو تو بڑی نعمتیں کہا جا سکتا ہے ۔

اس پہلو سے رب العالمین کی ناشکری بالکل نہیں اور شکرگزاریاں بہتیری ۔ تکلیفیں اس لیے ہوئیں کہ پونجی بالکل نہ تھی ۔ پاس والی رقم صرف اتنی تھی کہ کرایہ ہی چل سکتا تھا اور مصر پہنچ کر تو وہ کرائے کو بھی جواب دے گئی ۔ باقی ٹھہرنے ، چلنے، پھرنے اور کھانے پہننے کے لیے مکمل قلاشی تھی ۔ نہ گرہ بندھی ہوئی رقم کی طرف تاک سکتے تھے نہ کہیں باہر والے دست غیب کی کوئی مقرر امید تھی ۔ بھک منگٹی کی عادت کبھی پڑی بھی نہ تھی چاہے عمامہ و عبا میں لپٹی ہوئی بھیک منگٹی ہو ۔ پس یہ داؤں بھی خالی تھا ۔ وطن کے دوستوں سے پردیس کی تکلیفیں جتا جتا کر مانگنے کا ہنر ابھی مجھ کو نہیں آتا تھا ، نہ اس پردہ دار بے حیائی کے لیے ہی میرا ہیاؤ کھلا ہوا تھا اگرچہ چلتے وقت بعض بھروسے کے دوستوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ ہر تکلیف کے وقت ہمیں مدد کی تکلیف دے دینا ۔

مزدوری کرکے پیدا کرنے کو فرصت چاہیے ۔ یہاں فرصت کہاں ؟ روزانہ ۱۴ گھنٹے پڑھنا لکھنا میرا پکا معمول ، غرض کہ آمدنی کے تمام دروازے بند ۔ اب تکلیفوں کے جھکڑ نہ چلیں تو کیا ہو ؟ میں تو گویا قدرت سے لڑ رہا تھا ، قدرت کہتی کہ کھٹکھٹاؤ تو کھلے ، میں نہ کھٹکھٹانے کی قسم کھا چکا تھا ، تب کیسے کھاتا ؟ اور قدرت سے لڑنے والے کے لیے ہار کے سوا کیا ہے؟ اسی لیے میں نے تکلیف کو دل خندگی کے ساتھ جھیلا ۔ کراہیں تو

نکلیں پر آہیں نہیں نکلیں ۔

یہ تکلیفیں اس لیے بھی بغیر آہوں کے جھیل لی گئیں کہ تکلیفوں کے بوجھوں کے ساتھ تحصیلوں کی تھیلیاں بھی تو بندھی ہوئی تھیں ۔ پھر متوقع تحصیلوں کی فہرستیں بھی لٹکی ہوئی تھیں ۔ واہ رے تو اجر کی طاقت ؟ اور واہ رے تو امید اجر کی قوت ؟ تمھارے کیا کہنے ؟

سچ تو یہ ہے کہ اگر تم ساتھ ساتھ ہو تو مردود کے لیے ہمالیہ کا بوجھ بھی تنکے کے بار سے زیادہ نہیں اور شکر ہے کہ تم دونوں میری تکلیف بار سیاحت کی تکلیفوں کی بھیڑوں میں قدم بہ قدم موجود رہے ۔

پھر یہ کہ تکلیفیں تو جتنی بھی تھیں سب کی سب گذر گئیں تب ، اب وہ گنتی کے لائق کہاں ؟ لیکن جو تحصیلیں تھیں ان میں سب نہیں تو زیادہ تو یقیناً آج بھی اور اس وقت بھی جب کہ ان سطروں کو لکھ رہا ہوں ،میری زندگی میں تیر رہی ہیں ۔

تب میری سیاحت اگرچہ اس نے تکلیفیں بہت جھلوائیں ، مگر اور انجام کے اعتبار سے یقیناً کامیاب سیاحت تھی ، اس کامیابی پر رب العالمین کا شکریہ اور مخلوق رب العالمین کو ایک درس ۔

میری یہ سیاحت بھی خالص آزادانہ سیاحت تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی دو سیاحتیں تھیں ۔ نہ کسی نے سمجھایا نہ کسی نے دکھایا ۔ نہ کسی نے بھیجا ۔ نہ کسی نے بلایا ۔ نہ کسی نے پوچھا جانچا ۔ میں نے خود سوچا ، میں نے خود طے کیا ، میں آپ ہی

گیا ، آپ ہی آیا ، نہ کسی کو حساب نہ کسی کو روداد ۔ ایسی ہی سیاحت اصلی سیاحت ہوتی ہے باقی نقلی ہوتی ہیں ۔ شکر ہے کہ میری سیاحت اصلی سیاحت تھی ۔ مجھ سے کہا بھی گیا کہ جب جاتے ہو تو کسی جماعت کے نمائندے بن کر جاؤ ۔ میں نے اس عزت کے لینے سے انکار کیا تھا ۔ ساتھ ہی ایسی مددوں کو بھی واپس کر دیا ۔ میں نے کہا میں نہ نمائش کے لیے اپنی سیاحت کو تباہ کروں گا نہ مدد کے لیے میری اپنی حقیر سی ذاتی عزت میرے لیے بہت ہے ، اسی طرح میری چھوٹی سی پونجی بھی جو اگرچہ دوسروں ہی سے ملی ہے مگر سودے کی رقم کے طور پر نہیں ملی ہے میرے سہارے کو بہت ہے ، اس آزادگی اور آزادہ روی سے میں نے گھاٹے بھی اٹھائے مگر نفعے بھی اٹھائے ۔ پھر گھاٹے ہلکے تھے ، نفعے بھاری ۔ سب سے بڑا نفع یہ تھا کہ حج بدل والے حجوں کی طرح میری سیاحت تجارتی سیاحت اور تماشوی سیاحت بن کر نہیں رہ گئی بلکہ حقیقی سیاحت بنی جس میں دماغ آزاد اور روح پر عزت رہتی ہے ، ایسا نہیں ہوتا کہ اپنی شخصیت کو دوران سیاحت بھر کے لیے دوسروں کے ہاتھ بیچ کر کٹھ پتلی بنے گھوم رہے ہیں اور بھونپو بنے ہوئے دوسروں کی چیخیں سنا رہے ہیں ۔

میں اسی سختی کی وجہ سے صرف تین سیاحتوں تک محدود رہ گیا ورنہ میں تو شاید سیاحتوں ہی میں عمر کاٹ دیتا ۔ سیاحت کا سودائی بھی ہوں اور وسائل سیاحت کا ماہر بھی ۔

اسی سختی کی وجہ سے میں ساری عمر میں حج بھی ایک ہی کر سکا در آنحالیکہ بہتیرے ہیں جو حج ہی میں عمر کاٹ رہے ہیں ۔

گویا وہ حج ہی میں پیدا ہوئے ہیں ۔ حج ہی میں پل رہے ہیں اور حج ہی میں مر رہنے کا احرام باندھ چکے ہیں ۔

میری یہ سیاحت خالص قلندرانہ بھی تھی جیسا کہ خالص آزادانہ تھی یعنی اس وضع کی سیاحت تھی :

یہ یقین رکھ کہ جہاں زندہ نہ تو زندہ ہے
یہ دکھا دے کہ سبھی مردہ ہیں تو زندہ ہے
(زبور ربّانیت)

جب میں چلا تو رخصت کہنے کو کسی کو اسٹیشن نہیں لے گیا ، سوا اس ایک شخص نے جس نے تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے اور ڈاک گاڑی میں جگہ دلوانے میں مدد دی ۔ جہاز پر بیٹھنے میں بھی نمائش نہیں ہونے دی ۔

جب میں پہنچ گیا تب بھی یورپ کے اخباروں میں نہ ہندوستان کے اخباروں میں پہنچنے کی اشاعت کرائی حالانکہ اس کے سارے وسیلے بس میں تھے ۔

پھر چپ کے کمال کو یہاں تک پہنچایا کہ پورے دوران سیاحت میں ایک خط بھی کسی کے لیے روا نہ رکھا ، انگلستان پہنچا تو ہندوستان کو بھلا دیا ۔ امریکہ پہنچا تو انگلستان کو ذہن سے اتار دیا ، مصر لوٹا تو امریکہ کا رشتہ ختم ، ہندوستان واپس پہنچ گیا تو مصر کا رابطہ غائب ۔

غرض کہ اشتہار بازی کے بجائے اخفا بازی کا طریقہ برتتا رہا ۔

نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا کہ جب بمبئی پہنچا تو جہاز پر ایک لینے والا اور مبارکباد کہنے والا پرندہ بھی موجود نہ تھا ۔ چنانچہ بمبئی میں گودی سے شہر تک پہنچنے میں وہ تکلیف اٹھائی کہ معاذ اللہ ۔ چیخنا پڑا ، پھر بھی میں خوش اور سرخوش یعنی مست تھا اس بات پر کہ شکر ہے کہ میں راہ قلندری کے قابل نکل آیا اور میری سیاحت بھی قلندرانہ سیاحت کہلانے کے لائق ہو سکی ۔

لوگ میری اس روش کو جنونیت کہیں گے لیکن میں بفضلہ جانتا ہوں کہ یہ جنونیت نہیں ہے ، یہ اعلیٰ شعوریت ہے اور یہی اعلیٰ شعوریت ہے :

سیکھ گم ہونا کہ گم ہونا ہی ہے اصل الاکمال
قطرہ گم ہی ہو کے سیپی میں تو گوہر ہو سکا

(زاہور رسّالیت)

لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ اس گم ہونے نے آخر تمہیں کیا کمال دیا ؟ کیا نفع پہنچایا ؟

جواب میں کہوں گا کہ کمال یہ ملا کہ میری کم ظرفی سمٹ کر کافی مختصر ہوگئی ۔ میری صفت ضبط کاری و بے نیازی عروج کی طرف چل پڑی ۔ نفع یہ ملا کہ میری لیاقت بندگی میں پختگی آ گئی ، جس نے خود مجھے خود پر یہ بھروسہ دلا دیا کہ بندگی کی صلاحیت سے خالی نہیں ہوں پھر یہ کہ روحوں کی دنیا میں میری روح کو نوازنا گوارا کر لیا اور یہ نعمت اگر دوسروں کے لیے نہیں تو کم سے کم میرے لیے تو یقیناً وہ بڑی نعمت ہے کہ اگر ساری عمر

اس کی خوشی میں لگاتار رقص کرتا رہوں تو ذرا بے جا اور ذرہ برابر ،بالغہ نہ ہوگا ۔

کاش خود بینی اور خود نمائی کے متوالے اس باطنی گر کو سمجھ سکتے کہ ایک انسان ظاہر کی دنیا میں جتنی زیادہ خود سرانہ نمائش کرتا ہے ، باطن کی دنیا اتنی ہی زیادہ اس سے وحشت کھاتی ہے، البتہ حکم باطن کے تحت میں حکم بردارانہ نمود کی جائے تو اس کی بات اور ہے ۔

لیکن کیا یہ حرکت جرم بدنظمی کی مجرم نہیں ٹھہر سکتی ؟ ٹھہر سکتی ہے اور ٹھہر سکتی ہی نہیں ہے بھی ، مگر کیا کرتا بعض وقت منزل تک پہنچنے کے لیے کاوا بھی چلنا پڑتا ہے ۔ بعض وقت خود فراموشی کو فرض ٹھہرا لینا پڑتا ہے ۔ مثلاً ایسے وقت کہ اگر اس وقت خود فراموشی نہ برتی جائے تو خود فروشی ضروری ہو جائے ۔

تب بد لفظی کبھی کبھی جائز بھی ہو جاتی ہے ، بلکہ واجب تک ہو جاتی ہے، یہ کب؟ یہ جب جب کہ بد نظمی کے بغیر بد لفسی قابو میں آتی نظر نہ آتی ہو ۔

میری یہ سیاحت شہرت نہ پا سکی تھی ۔ یہ اس لیے کہ اشاعت نہ پا سکی تھی ۔ یہ اس لیے کہ خود میں نے جیسا کہ ابھی ابھی کہا ہے ، شہرت و اشاعت دینا چاہا نہیں تھا ، پھر بھی کچھ نہ کچھ شہرت تو قدرتاً ہو بھی پڑی ، مگر جتنی ہو پڑی اتنی بھی انجام کی رو سے زہر ہی ٹھہری ۔ اتنی سی شہرت کا یہ نتیجہ ہے کہ میں

روس اور چین نہ جانے پایا اور حکماً روک دیا گیا ورنہ حتماً روس اور چین کو بھی کب کا ناپ آیا ہوتا ۔

یورپ و امریکہ سے لوٹتے ہی بغیر آرام کا ایک دم لیے ہوئے میں روس اور چین کی زیارت پر کمر باندھ چکا تھا ۔ لیکن آہ کہ اس اقدام کو جائز ٹھہرانے پر دیسی حکومت ہند بھی راضی نہ ہوئی جیسا کہ بدیسی حکومت ہند اس سے پہلے راضی نہیں تھی ۔ لیکن کم شہرتی سے تو اس سیاحت کی قیمت پر کوئی آنچ نہیں آئی ۔ اس کی قیمت بہ دستور ہے ۔ ہیرا کان میں دبا رہ کر بھی پورا با قیمت ہے ۔

البتہ اب وہ شہرت پانے والی ہے کیونکہ اشاعت پانے والی ہے ۔ چنانچہ شہرت اور اشاعت کی پہلی قسط اس سفر نامہ کی اشاعت سے شروع ہوگئی ہے ، اب کیوں شہرت اور اشاعت پانے والی ہے تب نہ تھا ۔ ہر بھید ایسا نہیں ہوتا کہ اس کو ہمیشہ کے لیے پوشیدگی کے صندوق میں مقفل ہی رکھا جانا چاہیے ۔ بعض بھید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو آج تو اخفا کے کیسے میں بند رہنا چاہیے لیکن کل اس کو ڈنکے کی چوٹ پر ضرور ہی آشکارا ہو جانا چاہیے ۔

میری اس سیاحت کو بھی اس قسم کے بھید سے تشبیہ دینا چاہیے جس کا ایک موقع پر ڈھنڈھورے پر پٹ پٹ کر آشکارا ہونا ضروری ہو جاتا ہے ۔

میری اس سیاحت کے بابت غلط فہمیوں کا ایک جنگل عرصہ سے تیار ہے جس کا کٹنا بہترین مہموں کے واسطے ضروری ہے اور

اس جنگل کے کٹنے کا ٹھیک وقت آ چکا ۔ دیسی حکومت ہند شروع سے اس غلط فہمی میں ہے کہ میری یہ سیاحت مسلم لیگ کی طرف سے تھی اور پاکستان کے منصوبے کے سلسلے میں تھی ، اس خاص وجہ نے بھی دیسی حکومت ہند کو اس گمراہی کے خیال میں ڈالا کہ سبحانی ہندوستان کا پکا دشمن ہے اور اس لیے اس کو غیر ملک میں گھسنے ہی نہیں دینا چاہیے ۔ اس گمراہی کی وجہ تھی کہ دیسی حکومت ہند نے مجھ کو روس اور چین جانے سے روک دیا ۔ پھر میرا پرانا پروانہ راہ داری (پاس پورٹ) بھی چھین لیا جس کی رو سے میں یورپ و امریکہ تو چار سال تک جتنی بار چاہتا جا سکتا تھا اور اب جب کہ وہ میرا غریب عصائے سفر چھن چکا ہے ، یورپ و امریکہ کی طرف بھی اسی طرح منہ کرکے نہیں بیٹھ سکتا جس طرح روس اور چین کی طرف منہ کرکے نہیں بیٹھ سکتا ۔

اس غلط فہمی کا دور کیا جانا فرض تھا ، لیکن یہ فرض میری سیاحت کی اشاعت بغیر کیسے انجام پا سکتا تھا ، اس لیے میری اس سیاحت کی اشاعت ضروری تھی مگر اس کا موقع پہلے نہ تھا ، اب ہے ۔ پہلے کیوں نہ تھا اور اب کیوں ہے ؟ اس لیے کہ پہلے حکومت ہند ہوا میں اڑتی پھرتی تھی اب زمین پر چلنے لگی ہے ۔

لیکن اگر سفرنامے کی اشاعت کے بعد بھی حکومت ہند کی غلط فہمی نہ گئی ۔ تب ؟ تب یہ کہ خلقت کی غلط فہمی تو دور ہو ہی رہے گی اور یہ بھی چھوٹا کام نہیں ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ خلقت میری طرف سے صاف ہو کر مجھ کو روس اور چین کی اجازت دلوا دینے کی قدرت نہیں رکھے گی لیکن یہ قدرت تو رکھے گی کہ حکومت

سے سفارشیں کرے ، یہ بھی نہ کر سکے گی تو کم سے کم یہ تو کر ہی سکے گی کہ میرے منصوبہ روس و چین کے حق میں دعائیں شروع کر دے ۔

اچھا اس سفر نامے سے یہ غلط فہمی کہ میں سیاحت یورپ و امریکہ کے زمانہ میں ہندوستان کا دشمن تھا کیسے دور ہو سکے گی؟ ایسے دور ہو سکے گی کہ سفرنامہ بتائے گا کہ میری سیاحت پاکستان کے پروپگنڈے کے لیے تھی ہی نہیں ۔ تکمیل علم کے اپنے ذاتی مقصد کے لیے تھی ، پھر سفرنامہ یہ بھی بتائے گا کہ اگر میں نے اپنی سیاحت یورپ و امریکہ میں ضمناً تھوڑا سا کام مسئلہ پاکستان کے لیے کیا بھی ہے تو اتنا ہی کام مسئلہ ہندوستان کے لیے بھی کیا ہے، پھر یہ کہ دونوں کام مفت کیے ہیں ، از خود کیے ہیں ، خالص اپنی فکر اپنی تجویز اور اپنے دل کی اپنی تحریک سے کیے ہیں ۔ تب میں اگر دشمن تھا تو دونوں مسئلوں کا اور دونوں ملکوں کا ، دونوں نمائندہ جماعتوں کا اور دوست تھا تو دونوں مسئلوں کا اور دونوں کی نمائندہ ۔ پھر سفر نامہ بتائے گا کہ میں نے سیاحت میں جو اصلی کام کیا ہے تکمیل علم کے مقصد کے ساتھ ساتھ وہ صرف ربّانیت کا کام تھا جو خالص تنہا میرا کام ہے جس کو نہ ہندوستان اور نہ ہندوؤں کی دشمنی سے سروکار نہ پاکستان ، نہ مسلمانوں کی دوستی سے سروکار، بلکہ پوری انسانی دنیا اور نوعی پوری انسانی نوع کی دوستی سے سروکار، کیونکہ ربّانیت خالص عالمی اورنوعی چیز ہے ، وہ تو پورے انسانی لیے عالم کی بھلائی اور پوری انسانی نوع کی بھلائی چاہتی ہے ۔ اس کے لمبے چوڑے عالمی دائرے میں ہندوستان اور پاکستان تو مل کر

بھی دو نقطوں سے زیادہ نہیں ہیں ، پھر اسی کے اندر کے دو نقطے ہیں ، تب اس کی نظر میں ان دونوں کی کیا اہمیت ۔ پھر اس کے دل کو ان دونوں میں تمیز کی کیا ضرورت ؟

پھر سفرنامہ اُدھر بھی اشارہ کرے گا کہ روس اور چین کا سفر بھی امریکہ اور چین کے سفر کی طرح تکمیل علم کے ساتھ ساتھ صرف ربّانیت کی خدمت کے لیے ہوگا نہ کہ پاکستان کی خدمت کے لیے یا ہندوستان کی بے خدمتی کے لیے ۔

پھر سفرنامہ یہ بھی بتائے گا کہ حکومت ہند نے میری مجوزہ سیاحت چین و روس کو روک کر میرا ہی نقصان نہیں کیا ہے ، ربّانیت کا بھی نقصان کیا ہے اور یوں عالمیت کا نقصان کیا ہے اور یوں اس نے پوری انسانیت کا ۔ پھر خود اپنا بھی نقصان کیا ہے اور یوں اس نے زبردست حماقت بھی کی ہے اور زبردست جرم بھی کیا ہے ۔

سفرنامہ یہ باتیں بتا کر حکومت کی غلط فہمی کو ضرور دور کر سکے گا ۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ اس کو پڑھے اور سمجھے ، پھر نتیجہ نکالتے وقت اور اثر لیتے وقت دل کو بے خلاف بھی رکھے ۔

میری یہ سیاحت صرف تمہیدی سیاحت تھی جس کے بعد مقصدی سیاحت بھی ضروری چیز تھی، مگر افسوس کہ وہ اب تک کہ

چار سال گزر چکے ہیں نہیں بن پڑ سکی ، مجھے اس سیاحت کے بعد کم سے کم ایک دوسری سیاحت بھی یورپ و امریکہ کی کرنی چاہیے تھی - تب اس مبتدا کی خبر نکلتی لیکن آہ کہ میں یہ دوسری سیاحت کو جو مقصدی سیاحت تھی نہ کر سکا اور اس وجہ سے میری یہ سیاحت وہ مبتدا ہے جس کی خبر نہیں اور بحیثیت سیاح کے میں اس ناتمام کتاب کا مصنف ہوں جس کا صرف شروع ہے آخر نہیں لیکن یہ میرا قصور نہ تھا ، یہ حکومت کا قصور تھا ، میں تو اگر آج بھی پرانا ہی اجازت نامہ پا جاؤں تو فوراً ہی یورپ و امریکہ کی دوسری سیاحت پر اڑ کے روانہ ہو جانے کی کوشش شروع کر دوں - مگر آہ کہ حکومتیں آسانی سے نہیں پگھلتیں ، ان کی نگاہ مہر کا انتظار اس سے کم نہیں کرنا پڑتا جتنا بتان سنگدل کی نظر مہر کا انتظار کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض وقت تو اتنا انتظار کرنا پڑتا ہے جتنا انقلاب مثبت کا انتظار کرنا پڑتا ہے -

---

مگر مجھ کو اور حکومت کو دونوں کو جاننا چاہیے کہ تقدیر کی باگ نہ میرے ہاتھ میں ہے نہ اس کے ہاتھ میں ہے، اس تیسرے کے ہاتھ میں ہے جو میرے جیسے تنکوں اور ریزوں کو بھی الٹتا پلٹتا رہتا ہے اور حکومت جیسی چٹانوں اور سنگ خارا کے پہاڑوں کو بھی -

---

وقت آ سکتا ہے اور شاید آئے کہ اس تیسرے کے ایک اشارۂ ابرو پر حکومت اتنی مجبور ہو جائے کہ میرے رکے ہوئے پرانے اجازت نامہ کو بھی اور اس کے ساتھ ساتھ نئے اجازت نامے کو بھی جو چین اور روس کی سیاحت سے متعلق ہوگا بلا کسی درخواست کے خود

تیار کر کے خود میرے غریب آشیانے میں پھنکوا دے ۔ اسی ایک آس پر جلے چلا جا رہا ہوں ۔ اسی گرمی سے اب تک گرم بنا ہوا ہوں ورنہ کب کا ٹھنڈا ہو چکا ہوتا ۔ روس اور چین اور دوسرے مشرقی ملکوں کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لینا میرے لیے اتنی ہی قلق کی بات ہے جتنا ایک مزدور کے لیے مزدوری سے محروم رہ جانا ، جیسا ایک کاشتکار کے لیے اس کی جمی ہوئی فصل کا عین کاٹنے کے وقت برباد ہو جانا اور جتنا ایک امتحان کے لیے تیار طالب علم کا عین وقت پر امتحان سے نکال دیا جانا ۔

میرا جذبہ سیاحت کے متعلق تماش بینانہ تو بالکل نہیں رہ گیا ۔ عمر کی ٹھنڈ کے ساتھ ساتھ تماش بینی کے ولولے میں بھی ٹھنڈ آ چکی ۔ اب بجھی ہوئی آگ اور بے چنگاری کی راکھ ہوں جس میں گرمی تو رہ گئی ہے مگر جلن جاتی رہی ہے ۔ اب میرا جذبہ سیاحت صرف سنجیدگانہ ہے اور مقصدانہ ۔ مقصد صرف فرض کی ادائیگی ہے ۔ فرض دو ہیں ۔ ایک تکمیل علم کا فرض ، دوسرا دورہ خلیفۃ اللہیت کا فرض ۔ دوسرے فرض کو سمجھانے کے لیے مجھ کو یہ بتانا ہے کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ میں خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں جیسا کہ ہر مسلمان ہے، بلکہ فطرتاً تو ہر انسان ہے ۔ البتہ بنیادی نافرمانی کے سبب غیر مسلموں نے اپنا یہ منصب صلاحیت کی رو سے کم از کم اس وقت تک کے لیے کھو دیا ہے جب تک وہ بنیادی نافرمانی سے رجوع نہیں کر لیتے ۔ عام مسلمانوں نے بھی غفلتوں اور فروعی نافرمانیوں کے سبب قوت کی رو سے تو اس منصب کو کھو دیا ہے اور احساس کی رو سے بھی ، میں بھی فروعی نافرمانیوں کے

سبب قوت کی رو سے تو منصب خلیفۃ اللہ سے دوسروں ہی کی مانند
محروم ہوں مگر شکر ہے کہ چونکہ غفلت کا مجرم نہیں ہوں اس
لیے احساس کی رو سے اس منصب سے دور نہیں ہوں ۔

چونکہ احساس کی رو سے منصب خلیفۃ اللہ پر فائز ہوں ، اس
لیے اس کے کچھ فرض بھی اپنے ذمے عائد کیے ہوئے ہوں ، ان
فرضوں میں سے ایک فرض پوری انسانی دنیا کا اجمالی دورہ ہے ، یعنی
کم سے کم براعظمی دورہ جس کا یہ مطلب ہے کہ زمین کا کوئی
براعظم میری سیر سے رہ نہ جائے ۔ یا پھر جمیع الممالکی دورہ جس
کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ملک میری دیدا درد دیکھ بھال سے بچ
نہ جائے ۔

براعظمی والا اجمالی دورہ بھی آپ اب تک ادھورا ہے ۔ چھ
براعظموں میں سے صرف تین براعظم (افریقیہ ، یورپ ، شمالی امریکہ)
کو تحت نظر اور زیر قدم لا سکا ہوں ۔ دو براعظموں (جنوبی امریکہ
اور آسٹریلیا) کو ابھی تک چھو بھی نہیں سکا ۔ پھر براعظم یورپ
اور براعظم ایشیا کے بھی ان چند ملکوں کی بھی زیارت نہیں کی
جو براعظم نہ ہوتے بھی براعظم کی سی قیمت رکھتے ہیں ۔ مثلاً
جرمنی، اٹلی، سوئیزر لینڈ ہنگری ، اسی طرح روس ، چین ، جاپان ،
انڈونیشیا ، ترکستان ۔

غرض کہ پوری آدھی دنیا ابھی میری نظر سے چھپی ہوئی ہے
اور میری پہنچ سے دور بیٹھی ہوئی ہے ، اس کمی کا مجھ کو رنج
ہے ایسا رنج جو مجھ کو کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے اور شاید کہ

اندر ہی اندر کھلا بھی رہا ہے ۔

میں اپنے کو اس صاحب ریاست کی مانند سمجھتا ہوں جس نے اپنی ریاست کے آدھے حصے کو دیکھا تک نہ ہو ۔ میرا دل اکثر مجھ سے طنزاً پوچھتا رہتا ہے ، تم کیسے خلیفۃ اللہ فی الارض ہو کہ تم نے ارض کے آدھے ٹکڑے کی جھلک نہیں دیکھی ۔ میں اس سوال کو سنتا ہوں اور ایک آہ کرکے رہ جاتا ہوں ، اس لیے کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے ؟

میری یہ سیاحت صرف سرسری سیاحت تھی ۔ ابھی تک میں نے صرف سرسری جائزہ لیا ہے ، ان علاقوں کا جن میں گھوم سکا ہوں ، یا صرف سرسری داغ بیل ڈالی ہے ان کاموں کی جن کے منصوبے باندھ کر میں ان خطوں میں گھسا تھا اور چلا پھرا تھا ۔ پس غائری سیاحت ابھی باقی ہے ۔ جو ان داغ بیلوں کو بھرے گی جو پہلے ڈالی گئی ہیں ۔ جو جائزوں کو بھی گہرا کرے گی اور کاموں کو بھی گہرا بنائے گی ۔

میں اس سیاحت میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ یورپ اور امریکہ اڑے چلے جا رہے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکا کہ ان کے اڑانے والے بازو کیسے ہیں اور کن حامیوں کے ہیں ، اسی طرح اس سیاحت میں صرف اتنا کر سکا کہ یورپ اور امریکہ کے کانوں میں کچھ اپنی باتیں بھی کہنے کی خبر ڈال دی مگر یہ نہ کہہ سکا کہ وہ باتیں کیا ہیں ؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ باتوں کے عنوان سنا دیے مگر جو مضامین ان عنوانوں سے لپٹے ہوئے ہیں ان کی ہوا بھی انہیں نہ دے

سکا۔ آہ کہ بھاگم بھاگ کا کوئی کام کمبھیر نہیں ہوتا۔ مگر کیا کیجیے کہ پوری زندگی بھاگم بھاگ ہے۔

میری اس سیاحت کا میدان جولانی صرف مزدوروں، ادنٰی متوسطوں کا طبقہ تھا۔ میں اس میدان سے آگے جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور جا بھی نہیں سکتا تھا۔ آگے کی اڑان کے لیے دولت اور وجاہت کے بازو ضروری ہیں، میں ان بازووں کے حساب سے بے بازووں کا تھا لیکن یقین کیجیے کہ میں اس محرومی پر کڑھا نہیں۔ کڑھتا تو جب کہ جس چیز سے محروم تھا اس کی ہوس ہوتی۔ میری زندگی اور میری فطرت ایسی ہوسوں میں شکر ہے کہ شروع ہی سے نہیں پھنسی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سرمایہ داروں یا علماؤں کے طبقے سے نفرت کرتا ہوں۔ شکر ہے کہ میں نے ایسا تنگ دلانہ اور وحشت مندانہ مزاج نہیں پایا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ان بزرگوں سے ملنے کا شوق نہیں رکھتا نہ اس کارخیر کے لیے کوئی تکلیف اٹھانا چاہتا۔ البتہ

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

پھر بھی یہ ضرور دیکھا کہ میری اور اس طبقہ کی صحبت کبھی راس نہ آئی اور نبھی تو بالکل نہیں، بعض صحبتیں تو جنگ پر ختم ہوئیں، یا ایسی بے لطفی پر جو جنگ ہی کی چھوٹی بہن ہے، لیکن اس معاملے میں قصور وار اپنے ہی کو سمجھتا رہا ہوں اور آج بھی سمجھتا ہوں، وہ خیر بھی ناقص ہی ہے جو شر سے ساز نہیں

کر سکتا ۔ وہ روشنی جو اندھیرے سے بھاگتی پھرتی ہے اور اس کو ہضم کر ڈالنے کی جرأت نہیں کرتی وہ دراصل روشنی ہی نہیں ۔ دنیا کی ترقی میں مزدوروں کے پہلو بہ پہلو اب تک اس طبقہ والوں کا بھی حصہ رہا ہے اگرچہ میں نے بھی دوسرے مزدوروں اور ادناؤں کی طرح ان کے ہاتھوں تکلیف اٹھائی ہے اور نقصان ہی سمیٹا ہے لیکن سچائی یہی ہے کہ یہ طبقہ بھی قیمت کا ایک مقام رکھتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ آنے والے زمانے کے نئے نظام میں اس طبقہ کی کھپت نہ ہو سکے اور نظر یہی آتا ہے ۔ پھر بھی اس کی گذشتہ قیمت پر موجودہ قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

پھر اس لیے بھی اس طبقہ سے نہ مل سکنے پر طبیعت کڑھی نہیں کہ میں نے ان ادناؤں ہی میں ان اعلاؤں کا بھی تماشا کر لیا ۔ جڑوں میں پھنگیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور جھونپڑوں میں محل بھی ، بغیر اس کے کہ پھنگیوں تک اڑو اور محلوں میں داخل ہو ۔ البتہ اس کام کے لیے خاص آنکھیں چاہئیں ۔

بہرحال میری سیاحت ادناؤں ہی کے لیے تھی اور ادناؤں ہی میں رہی پھر بھی میں اعلاؤں کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہا، کیونکہ ادناؤں میں اعلیٰ لوگ بھی برابر جھلک رہے تھے ۔

میں اس سیاحت میں نہ دولت مندوں سے ملا نہ سیاسی زعیموں یعنی پولٹیکل لیڈروں سے بلکہ صرف مزدوروں سے ملا اور علم والوں سے ۔ مثلاً پروفیسروں سے اور مصنفوں سے کیونکہ یہی میری پسند کے لوگ تھے اور اس کے لوگ بھی۔ انھیں دو گروہوں سے مجھے سیکھنا

تھا ۔ چنانچہ میں نے انھیں سے وہ سب کچھ سیکھا جو میرے لیے
یعنی میرے فلسفہ کے لیے ضروری تھا ۔ باقیوں سے مجھے کچھ سیکھنا
نہ تھا ۔ دولت مجھ کو پیدا نہیں کرنی آتی ، سیاست مجھ کو پوری
آتی تھی ۔

میری یہ سیاحت تماشا بینی کی کوئی حیثیت نہیں رکھتی لہذا
میں نے قصداً یورپ و امریکہ کی تماشا گاہوں سے کوئی دلچسپی
نہیں لی ۔ تھیٹر اور سینما تو بالکل نہیں دیکھا ۔ اسی طرح دوسرے
ناچ گانے بھی نہیں دیکھے ، سوا جہاز اور گنذرگاہ کے ایک
گانا ، سینما اور دو رقصوں کو جن کو جبراً دیکھنا پڑا تھا، جیسا کہ
امام ابو حنیفہ[7] کو ایک بار گانا جبراً سننا پڑا تھا تا کہ فطرت
کے جذبات کا قتل اور لو عمروں کے عمری تقاضاؤں کا خنق
(گلا گھونٹ) لازم نہ آئے اور تا کہ دنیا کو یہ جتا دیں کہ اسلام
اس روکھے پن اور جو کڑے پن یا بیراگ اور زہد خشک کا قائل
نہیں ہے جو فنون لطیفہ اور جذبات حسینہ کے مار ڈالنے کا فتویٰ
دیتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی دکھانا اور سنانا پڑا تھا تا کہ وہ
غلطی سے بیراگ پسند اور زاہد خشک بن کر زندگی کو خالص عقبوی
اور روحانی بنا کر گمراہی اور بربادی کی طرف نہ دھکیل دیں ۔

تھیٹر اور سینما سے میری بے پروائی اس بنا پر نہیں تھی کہ
تھیٹر اور سینما کو حرام سمجھتا تھا ۔ اگر میں خدا ناخواستہ تھیٹر
اور سینما کو حرام ٹھہرا دوں تو پھر پوری دنیا کو بھی جو قدم قدم
پر تھیٹر اور سینما لیٹے ہوئے ہیں حرام ٹھہرانا پڑے گا میں اس
دلیری کے لیے تیار نہیں بلکہ اس بنا پر تھی کہ میرے جذبات

رنگین مں چکے تھے ورنہ میں تو مولانا روم اور نظام الدین اولیا کا بہ شوق خا کہ اڑاتا ، جو دوسروں کا ناچ اور راگ دیکھتے سنتے بھی تھے اور خود گاتے اور ناچتے بھی تھے۔ پھر اس بنا پر بے پروائی تھی کہ فکری کاموں سے فرصت کہاں ؟ اور مہلت کس کو ؟

میں نے مشہور مقاموں اور یادگار عمارتوں کے دیکھنے پر ایک لحظہ نہیں خرچ کیا ۔ بعض پر گزرا ضرور مگر گزرا اور گزرتا ہی گزر گیا ۔ میں نے یورپ اور امریکہ کو تماشا گاہ نہیں درس گاہ کی شان میں دیکھا ، اس لیے میں نے اس سے سیکھا تو بہت کچھ مگر جی بالکل نہیں بہلایا ۔ نہ اس کو دیکھ کر اپنی ہنسی خوشی میں کوئی اضافہ کیا ۔

مگر میں اپنے اس طریقہ پر فخر نہیں کرتا افسوس کرتا ہوں ۔ میں نے یہ کرکے اپنے مالک کی قدرت کی اور اس کے مخلوق انسانوں کی لیاقت کی حقارت کی ۔ یہ ایک جرم ہوا۔ جرم پر فخر نہیں کیا جاسکتا ۔ صرف افسوس کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ چونکہ نیت کے ساتھ جرم نہیں کیا گیا تھا ، لہٰذا آسان معافی کی امید ہے ، پھر بھی جو نقصان پہنچا ہے اس کی تو تلافی نہیں ہو سکتی ۔
میرا یہ طریقہ راہبوں کا یعنی جوگڑوں کا طریقہ تھا جو فلسفۂ ربّانیہ اور دین ربانی دونوں میں رد کیا ہوا دستور ہے ۔

میرا پکا ارادہ ہے کہ اگر یورپ اور امریکہ کی بہشت میں دوبارہ داخل ہوا تو اس غلطی کا انشاء اللہ کفارہ کروں گا یعنی اس بہشت کے تماشے بھی دیکھوں گا اور اس کی مخصوص نعمت گاہوں

اور صنعتی شاہکاروں کی بھی سیر کروں گا اور ان کی حکمتوں سے اسباق سیکھوں گا۔

چونکہ لاپروائی کی غلطی ہوئی اس لیے میں یہاں کے مشہور مقامات اور تماشاجات کی فہرستیں بھی قلم بند نہ کر سکا۔ تب میں اپنے سفرنامے میں اس قسم کی فہرست کیسے دے سکوں گا۔ اچھا اس کمی کے لیے بھی اپنے سفرنامے کے پڑھنے والوں سے معافی چاہ لوں گا جیسا کہ تاریخوں کو چھوڑ دینے کی معافی چاہوں گا اور چونکہ خطائیں معمولی ہیں لہٰذا معافیاں بھی آسانی سے مل جا سکیں گی۔

میں نے یورپ اور امریکہ میں اسی طرح وقت کاٹا جس طرح ایک خلوتی صوفی اپنے حُجرۂ ریاضت میں وقت کاٹتا ہے گویا میں میکدہ کا صوفی تھا۔ میں یورپ و امریکہ میں اپنے کمروں میں بند پڑا رہتا تھا۔ صرف نکالنے سے نکلتا تھا اور صرف دو کاموں کے لیے نکالا جا سکتا تھا۔ ایک تقریر اور دوسرے کسی تدبیر کے لیے۔

ملنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ میں پہلی بار کا سیاح، کس طرح بہشت سے آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہتا ہوں، میرا یہ حال دیکھ کر دوستوں نے یہ تنبیہہ بھی کر دی کہ یہ سخت گوشہ نشینی تندرستی کو بھی تباہ کر دے گی۔ بعض دوستوں نے تو مجھ پر دن میں ایک بار باہر نکلنے کی جبری قید بھی لگا دی لیکن اس قید کو اسی دن پورا کیا جا سکا جس دن دوست صاحب کا جبر سر پر سوار ملا کیا۔ ورنہ اس قید کے باوجود میں ہوتا تھا اور میرا پیارا طالب العلمی کا کمرہ جو کتابوں کے سوا اپنی بساط پر کچھ

نہیں رکھتا تھا اور جس کے در و دیوار یا تو مطالعہ اور فکر اور تحریر کے خاموش تماشے دیکھا کرتے تھا یا پھر میرے ان درسوں کی پرجوش آوازیں سنا کرتے تھے جو آنے والے طالب علموں کو دیے جایا کرتے تھے۔

جنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بہشت صرف راحت کی جگہ ہے عمل کی نہیں۔ انھیں میری یہ کہانی سن کر اپنا یہ غلط عقیدہ بدل ڈالنا چاہیے اور اس نئے عقیدے کو اختیار کر لینا چاہیے کہ بہشت عمل والوں کے لیے عمل کی بھی جگہ ہے جیسا کہ راحت کی جگہ ہے۔ البتہ کاہلوں کے لیے اکیلی راحت کی جگہ ہے۔

میری یہ سیاحت تکلیفوں اور ذلتوں کی بھی سیاحت تھی، آسائیشوں اور عزتوں کی بھی سیاحت تھی۔ اکثر وہ تکلیفیں اور ذلتیں بھی اٹھائی ہیں کہ بے ساختہ اللہ یاد آ گیا ہے اور بلا ارادہ تہہ دل سے اضطرارانہ دعائیں نکل نکل پڑی ہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ آسائشیں اور عزتیں بھی گود میں آ پڑی ہیں کہ روح ناچ ناچ اٹھی ہے اور بے تکلیف روئیں روئیں سے شکر اور شکرانے پھوٹ پھوٹ پڑے ہیں۔

تکلیفیں اور ذلتیں زیادہ تر مجبوریوں سے لیکن کبھی کبھی غلطیوں سے بھی برآمد ہوتی تھیں۔ مجبوریوں کے اکثر علاج نہیں ہو سکے۔ لیکن غلطیوں کے علاج ضرور کر لیے جاتے تھے۔ لا علاج مجبوریوں پر لازماً تقدیر کو مان لینا پڑتا تھا اور تدبیر کو بھی ماننے والی عقل مجبوراً سر جھکا دیا کرتی تھی، البتہ وہ مجبوریاں جن

کے علاج ہو جایا کرتے تھے اور وہ غلطیاں جو مٹا دی جایا کرتی تھیں، تدبیر کے عقیدے کو بھی منوا لیتی تھیں اور یوں میرا یہ عقیدہ مضبوط ہوتا گیا کہ تقدیر بھی ٹھیک ، تدبیر بھی ٹھیک تب جبر بھی ٹھیک اختیار بھی ٹھیک تب توکل بھی ٹھیک کوشش بھی ٹھیک، مطلق تقدیر ، مطلق توکل کا راستہ بھی غلط اور مطلق تدبیر مطلق اختیار مطلق کوشش کا راستہ بھی غلط ، تب وہ بھی خطا کار اور گمراہ جو اس مطلق پر جمع ہوئے ہیں اور وہ بھی خطا کار اور گمراہ جو اس مطلق پر اڑے ہوئے ہیں ۔ آسائشیں اور عزتیں بھی دونوں راستوں سے آئیں یعنی تدبیر اور کوشش کے راستے سے بھی اور فضل اور غیب کے راستے سے بھی ۔ بعض آسائشیں اورعزتیں، میری تدبیر اور کوشش کا پھل بن کر آئیں اور بعض اس طرح ٹپک پڑی ہیں جس طرح درخت کے پکے پھل آپ ہی آپ ٹوٹ کر کسی راہ گیر پر راہ چلتے ٹپک پڑیں ۔

ان دونوں نے بھی مل کر تقدیر اور تدبیر اور توکل اور کوشش دونوں کے جمع کے عقیدے کا پکا بنایا ۔

میری اس سیاحت نے محنت اور دولت کے جمع کے عقیدے کو بھی سکھایا ۔ میں پہلے صرف محنت کا قائل تھا ، دولت کا نہیں ۔ اس سیاحت نے مجھ پر یہ کھولا کہ محنت صرف ایک بازو ہے ۔ دوسرا بازو دولت ۔ ایک بازو اڑنے کو کافی نہیں ، دوسرا بازو بھی ضروری۔ تب محنت پر اتنا گھمنڈ نہ ہو کہ دولت کے لیے بے پروائی آ جائے ۔

میرے بعض وہ کام جو اکیلی دولت کے کام تھے ، اکیلی محنت سے یا تو ہو بھی نہ سکے یا ہوئے تو دیر لگی اور کلفت اٹھانی

پڑی ، اس وقت قدرتاً یہ حسرت اٹھی کہ کاش دولت بھی ایک خدمت گذار ہوتی ۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ میں نے سرمایہ دار بننے کی حسرت کی ۔ ہرگز ہرگز نہیں ، معاذ اللہ، معاذ اللہ بلکہ یہ مطلب لیا جائے کہ ضرورت کے وقت ضرورت کے لائق پونجی ہوتی تو اچھا ہوتا ۔

میری اس سیاحت نے میرے عقیدۂ ربّانیت کو بھی پوری شہ دی ۔ میں نے دیکھا کہ سرمایہ پرستی اور غریبی کے مغرب میں بھی اتنے ہی دانت اور گوشت ہیں جتنی مشرق میں غریبی مغرب کی بھی اتنی ہی دردناک ہے ، جتنی مشرق کی ۔ پھر سرمایہ پرستی مغرب میں بھی اتنی ہی خوں خوار اور خون آشام ہے جتنی مشرق میں ۔ پھر دونوں کی لڑائیاں یہاں بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی مشرق میں ۔

پھر یہاں بھی میرے دماغ نے مجھ سے یہی کہا کہ جب تک سرمایہ پرستی کی زہریلی گھاس چھیل کر پھینک نہ دی جائے گی ، انسانی زندگی کی کھیتی لہلہانے نہ پائے گی ، سرمایہ پرستی کے نقوش جب تک انسانی جمعیت کی تختی پر ابھرے رہیں گے ، عافیت عامہ کے نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے ہیں ۔ پھر یہاں بھی میرے دل نے پکارا کہ یا تو ربانی انقلاب ضروری ہے یا پھر زمین پر انسانی جہنمیت مستقل اور دائمی ۔

میری اس سیاحت نے مجھے مذہب اور فلسفہ دونوں کی یکساں حقانیت اور استحکامیت کا بھی مزید یقین دلا دیا ، میرا یہ پرانا اور

اٹل عقیدہ اور زیادہ اٹل ہوگیا کہ مذہب اور فلسفہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ، ایک ہی صداقت کی دو تفسیریں ، ایک ہی اصلیت کی دو تشریحیں ہیں اور اس لیے وہ آپس میں دو دشمن نہیں ہیں بلکہ دو دوست اور مددگار دوست ہیں ۔ دونوں کے صرف جاہل اور پاگل ماننے والوں نے اپنی طرف سے اپنی خیالی دنیا میں ان دونوں کی دشمنی گڑھ لی ہے اور وہ اسی گڑھی ہوئی دشمنی کو جانے اور بڑھانے چلے جا رہے ہیں ۔

میں نے فلسفہ کی اس پر شور طوفانی دنیا میں ، جس کو مغرب کہتے ہیں جہاں کی بابت یہ یقین کر لیا گیا ہےکہ یہاں مدتیں ہوئی ، غریب مذہب جڑ سے اکھڑ چکا ، دیکھا کہ مذہب ابھی تک اپنے قدم جمائے کھڑا ہے ۔ یہ بیشک ہوا ہے کہ اس کی پرانی شکل بدل گئی ہے ، وہ بوڑھا نہیں رہ گیا ہے جوان بن گیا ہے۔ اب وہ چہرے پر عقل کی سرخی اور فکر کی تازگی رکھتا ہے اب اس کی شکل فلسفہ کی شکل سے بہت ملتی ہوگئی ہے اس لیے اب اس کے پرانی شکل کے آشنا اس کو پہچان نہیں پاتے اور کہہ اٹھتے ہیں کہ ہائے مذہب مظلوم چل بسا اور انا للله و انا الیہ راجعون ، حالانکہ مذہب مظلوم چل نہیں بسا بلکہ اور زیادہ جم گیا البتہ وہ جو فلسفے سے بالکل کورے ہیں حتیٰ کہ اس کے ذوق سے بھی کورے ہیں جیسا کہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ہیں، اس بات کو باور نہیں کر سکتے، خود میں نے بھی جب تک فلسفے کی عینک لگا کر یہاں کا حال نہیں دیکھا ، یہی دھوکا کھاتا رہا ، البتہ یہ بتانے کی بات ہے کہ اب یہاں مذہب میں کیا جدت آ گئی ہے ، یہ جدت آ گئی ہے کہ یہاں

مذہب میں فلسفہ بن گیا ہے لیکن اس فلسفے کا عین جو سطح ہی پر نہیں تیرا کرتا ہے گہرائی میں بھی اترنا چاہتا ہے، ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کو بھی لپیٹ لینے کی آرزو میں ہے، یہی حال ہے یہاں فلسفے کا۔ یہاں مذہب بھی فلسفے کو نقصان نہیں پہنچا پایا اگرچہ اس نے کوشش ضرور کی۔ فلسفے کا زور اس کے روکے رک نہیں سکا۔ فلسفے کی باڑھ برابر باڑھ پر رہی یہاں تک وہ ابھر سے سمندر بن گیا اور زمین پر رینگتے رینگتے آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

بہرحال میں پورے زور سے اعلان کرتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ میں اللہ رب العالمین کے فضل سے مذہب قائم ہے اور پہلے سے بہتر حال میں قائم ہے، کیونکہ فلسفہ و حکمت اس سے جڑ گیا ہے جو پہلے بہت عرصہ تک الگ الگ چل رہا تھا اور یہی اللہ ربالعالمین کی مشیت تھی، لیکن اب یہ مشیت ہے کہ جڑ کر ملے اور یہ مشیت اس لیے ہے کہ مذہب کی بڑی بھلائی اسی میں ہے، کیونکہ زندگی، قانون زندگی اور زندگی کی پیروی کی بڑی بھلائی اسی میں ہے، یہ اس لیے کہ اللہ رب العالمین نے اپنی کتاب حکیم یعنی قرآن حکیم میں خود فرمایا ہے کہ:

"جس کو فلسفہ و حکمت دیا جاتا ہے اسی کو بڑی بھلائی دی جاتی ہے"۔

(من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا) مختصر یہ ہے کہ یہاں اب بھی فلسفیانہ اور حکیمانہ مذہب قائم ہے جس نے اندھی تقلید اور توہم پرستی کو جڑ سے ختم کر ڈالا ہے اور اس کی جگہ تحقیق اور

حقیقت دوستی کی نئی فضا قائم کر دی ہے ۔ البتہ غیر فلسفیانہ غیر حکیمانہ ، غیر عاقلانہ ، خالص مقلدانہ ، خالص وہمانہ مذہب ختم ہو چکا ہے اور اچھا ہوا کہ ختم ہو چکا ہے اور ضروری بھی تھا کہ ختم ہو جائے ۔

یہ بھی سن لیجیے کہ میں یہ اعلان بے دیکھے نہیں کر رہا ہوں ، نہ سرسری دیکھ بھال سے کر رہا ہوں ، بلکہ دیکھنے کے بعد کر رہا ہوں اور گہری دیکھ بھال سے کر رہا ہوں ۔

میں اس دید اور یافت پر خوش بھی ہوں اور بہت خوش کیوں ؟ یوں کہ مذہب خدا نخواستہ مٹ گیا ہوتا تو انسان برباد ہو جاتا ، کیونکہ جانور اور ابلیس ہو جاتا ۔ جانور اور ابلیس کا جو حشر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کم سمجھ انسان پر بھی چھپا ہوا نہیں ہے ۔

شکر ہے کہ مذہب کے قائم ہونے کے سبب انسان مسخ ہونے سے بچ گیا ۔ وہ فلسفہ کی اونچی ترقی کے باوجود بھی انسان ہی بنا بیٹھا ہوا ہے ۔ نہ ابلیس بنا نہ جانور ، حالانکہ دونوں بن جانے کا خطرہ تھا ۔ لیکن کیسے ٹل گیا یہ خطرہ ؟ ایسے ٹل گیا کہ اللہ رب العالمین کی مشیت ترقی و ارتقا کا قانون بنا چکی ہے اور ترقی و ارتقا کے قانون کے بموجب یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ انسان کو کبھی بھی مجموعی حیثیت سے گھٹانے کا نہیں ، حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ مہدی اور مسیح آئیں گے ، اس وقت بھی نہیں کہ جب قیامت کا صور پھنک رہا ہوگا ، اس وقت بھی نہیں جب اپنے

اپنے اعمال کے پھل کے طور پر جنت اور جہنم میں گھس رہے ہوں گے بلکہ ہمیشہ بڑھاتا رہے گا۔

یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے میری کتاب (کلیات دین) کے پڑھنے والوں کو۔ وہ یہ کہ میں نے وہاں تو کہا ہے کہ یہ زمانہ عالمگیر بے دینی کا زمانہ ہے اور یہاں کہہ رہا ہوں کہ مغربی دنیا تک میں جو بے دینی کا سب سے بڑا اڈا ہے دینداری جوں کی توں قائم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی دنیا میں تو ضرور ہی موجود ہوگی۔ کیا یہ دونوں قول ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ میں نے کلیات دین میں جو کچھ کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقی بے دینی عالمگیر ہوگئی ہے بلکہ یہ ہے کہ سطحی بے دینی عالمگیر ہو رہی ہے یعنی اوپر اوپر دین کا انکار پھیل رہا ہے لیکن اس سے حقیقت والے دین پر کوئی آنچ نہیں آ سکی۔ چنانچہ کلیات دین ہی میں میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حقیقت کی رو سے بے دینی ناممکن چیز ہے اور دین داری ناگزیر چیز۔ اس لیے وہ بھی جو دین کا انکار کرتے ہیں، عملی طور پر دین ہی پر چلتے ہیں اور دین کی پیروی کرتے ہیں۔

میری اس سیاحت نے یہ بھی مجھ پر جتایا کہ مذہب اور تمدن کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں، یہ غلط خیال پھیل گیا ہے کہ مذہب اور تمدن مغربی دنیا میں ساتھ ساتھ نہیں چل رہے ہیں۔ میں نے آنکھوں سے دونوں کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھا البتہ ہر سیاح اس بات کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف وہ سیاح دیکھ سکتا ہے جس کی آنکھیں فلسفہ کی نظر رکھتی ہوں۔

یہ ضرور ہے کہ مذہب اور تمدن کی اس صلح میں جھکنا مذہب کو پڑا ۔ تمدن اکڑا ہی رہا اور اپنی اکڑ کو منوا کے رہا۔ لیکن اس جھکاؤ میں مذہب کا بھی کچھ بگڑا نہیں بلکہ کچھ بن گیا۔ مذہب کی اکڑ جو اس سے پہلے تھی بالکل بیجا تھی ۔ اس بے جاپنے کی بدولت وہ تمدن سے لڑا تھا اور اس کی ترقی میں روک بنا رہا تھا ۔ مذہب نے اس بے جاپنے کو اب چھوڑ دیا ہے اور اتنا ہی مطلب ہے اس کے جھکاؤ کا ۔ تب تمدن کے سامنے مذہب کے جھکاؤ نے مذہب کا بگاڑا کیا ، بلکہ بنایا ہی ، اس لیے کہ بے جاپنے کی حرکت سے مذہب کو نکال لیا ۔

میں نے ان ہی آنکھوں سے دیکھا کہ تمدنی جلسوں کے ساتھ ساتھ مذہبی جلسوں میں بھی کافی رونقیں ہوتی ہیں ۔ چرچ بھی ٹاوروں اور عالی شان محلوں کے ساتھ اب تک شان سے چل رہے ہیں ، اتوار کے دن چرچوں میں بھی بھیڑیں لگتی ہیں اور پادری کے مواعظ سنے جاتے ہیں ، پھر خود تمدنی کاموں کے اندر بھی مذہب کی باتیں گھس پڑیں ہیں جنھیں کم عقل عوام تو مذہب کی چیزیں نہیں مان سکتے مگر پوری عقل والوں پر یہ اچھی طرح روشن ہے کہ وہ مذہب ہی کی باتیں ہیں ۔

میری اس سیاحت نے یہ بھی دیکھا کہ مغربی دنیا امن و صلح کی خواہشوں سے بھی لبریز ہوتی جا رہی ہے ۔ گروہ کے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو جنگ سے دلی نفرت کرتے ہیں اور جنگ کو متروک

چیز بتاتے ہیں ۔ اپنا عیش و آرام تک ترک کر دینے پر تلے ہوئے ہیں ۔ مشرقی دنیا یہ سمجھے بیٹھی ہے کہ مغربی دنیا صرف جنگ کو پیار کرتی ہے ۔ یہ مشرقی دنیا کی بھول ہے ۔ اس نے مغربی دنیا کو غلط سمجھا ۔ یہ غلطی اس لیے بھی ہے کہ مشرقی دنیا اب تک جہالت اور تعصب سے باہر نہیں نکل سکی ۔

میری اس سیاحت نے یہ بھی پا لیا کہ مغربی دنیا مشرق دنیا سے نفرت نہیں کرتی بلکہ محبت کرتی ہے اور یہ بات عجیب بھی نہیں ہے ۔ مغرب نے شروع میں مشرق ہی سے تو سب کچھ سیکھا تھا ۔ مذہب بھی ، علم بھی اور تہذیب بھی ۔ پھر مغرب ناشکرا بھی نہیں ہے شکر کرنا جانتا ہے ۔ شکر کرتا بھی ہے ۔ مشرق کا شکر ادا کر چکا ہے اس نے مشرق سے جو کچھ پایا تھا اس کو مع سود اس کو لوٹا چکا ہے ۔ پھر وہ مشرق کو بخوبی جان چکنے بعد بھی مشرق کی واقفیت کی پیاس کو بجھا نہیں چکا ہے ۔ اب بھی مشرق کا جب کبھی ذکر آ جاتا ہے تو چلا اٹھتا ہے ، بھیدوں کی زمین بھیدوں کی زمین ، تب نفرت کہاں ؟ محبت کیوں نہیں ؟ ذلت کس طرح ؟ مشرق اس معاملہ میں بھی بھول میں ہے ، خواہ مخواہ چلائے جا رہا ہے کہ مغرب ہم سے نفرت کرتا ہے ، مغرب ہماری ذلت کرتا ہے ، مغرب ہمارا دشمن ہے ۔

میری اس سیاحت نے یہ عجیب بات بھی معلوم کرائی کہ مغرب باطنیت کی طرف جھکتا جا رہا ہے اور کوششیں بھی لگاتار کرتا جا رہا ہے ۔ پھر اس میدان میں بھی وہ وہی سنجیدگی دکھانے

لگا ہے جس کو ظاہریت کے میدان میں دکھا چکا ہے اور دکھاتا جا رہا ہے اور قیاس ہے کہ یہ خطرہ نازل ہو کر رہے گا۔

مشرق باطنیت سے اول تو بھاگ ہی چلا ہے۔ کمال اور فن والے تو اس کوچے میں صدیوں سے پیدا نہیں ہو رہے ہیں، طریقہ باز آج بھی ان گنت ہیں، مگر انھیں لےکر کیجیے کیا؟ اوڑھیے یا بچھائیے۔ مگر پھر بھی ایک تبرک یا یادگار کے طور پر انھیں جھیلے جائیے تو مضائقہ نہیں۔

مشرق میں مقصد اور نصب‌العین کا معیار بھی پست ہے اور مغرب میں بلند۔ تب نتیجہ سوا اس خطرے کے ہو ہی کیا سکتا ہے؟ لیکن کوئی پوچھ لے سکتا ہے کہ تم نے مغرب کی برتری کے امکان کو خطرہ کیوں کہا، کیا تم بھی مغرب سے حسد کرتے ہو؟ جواب یہ ہے کہ میں یہاں خطرہ کا لفظ اصلاً نہیں بولا ہوں۔ طنزاً بولا ہوں۔ میں کہ ربّانی ہونے کے سبب عالمی ہوں۔ نہ مشرقی ہوں، نہ مغربی اور مشرق اور مغرب کے اتحاد کا پیدائشی عقیدہ رکھنے والا ہوں اور اس کی تبلیغ کرنے والا ہوں، بھلا مشرق اور مغرب میں نفساتی فرق کر سکتا ہوں، بھلا یہ مجھ سے ہو سکتا ہے کہ مشرق کو دعائیں اور مغرب کو کوسنے دوں۔ آخر رب العالمین کو جو رب‌المشارق اور رب المغارب ہے، کیا منہ دکھاؤں گا۔

(فلسفۂ ربّانی، ص ۶۴ - ۶۳)

مشرق و مغرب کی جوہری یک رنگی اور اصولی قومی وحدت

عوام کی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ مشرق اور مغرب کی دنیا بالکل جدا جدا دنیائیں ہیں ۔ بھلا ان دونوں میں تم کو بھی کچھ مناسبتیں ہو سکتی ہیں ۔ بالکل نہیں ۔ ان دونوں میں اتنی ہی غیریت اور ضدیت ہونی چاہیے اور ہے جتنی لوح کے بیٹوں سام ، حام ، یافث میں تھی ۔ ایک کی اولاد گوری ، دوسرے کی کالی، تیسرے کی زرد۔ بلکہ اتنی ہی غیریت و ضدیت ہونی چاہیے جتنی فرستے اور شیطان میں ۔ لیکن عوام کی دنیا کی یہ سمجھ بالکل ہوا ہو جاتی ہے جب کہ مشرق دنیا کا کوئی آدمی مغربی دنیا میں جا پڑتا ہے اور مغربی دنیا کا کوئی آدمی مشرق دنیا میں آ پڑتا ہے ۔ اس وقت حیرت اور اچنبھے کے ساتھ یہ اصلی بات کھل پڑتی ہے کہ دونوں دنیا میں ایک ہی جنس کی انسانیت کی دو دنیائیں ہیں، بلکہ ایک ہی صنف کی انسانیت کی دو دنیائیں ہیں ۔ دونوں کے بسنے والوں میں کچھ فرق بھی ہوگا، مگر وہ فرق اتنا باریک ہوگا کہ ہماری سرسری نگاہیں ، بلکہ سرسری سمجھیں بھی اس کو دیکھ نہیں پاتیں ۔ ہم مجبور ہوکر چلا پڑتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ماں کے جائے ہیں ۔ جو فرق دکھائی دیتا ہے وہ اتنا ہلکا ہے کہ اس کے سہارے پر دونوں دنیا والوں کو دو صنف بھی نہیں کہا جا سکتا ، چہ جائے کہ دو قوم ، پھر چہ جائے کہ دو جنس ۔

چنانچہ میں بھی ان عوام میں سے ایک تھا جو اس مغالطے کو

پکائے جا رہا تھا کہ مغربی اور مغربی دنیاؤں کے انسان علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علیحدہ علیحدہ جنس ہوں یعنی دونوں علیحدہ علیحدہ آدمیوں کی نسلیں ہوں ، ایک آدم کی نسلیں نہیں ہوں ۔ میرا یہ مغالطہ اس وقت بھی رہتا تھا جب میں مغربی دنیا والوں کو ہالستان یعنی ہندوستان اور پاکستانی علاقوں میں نزدیک سے بھی دیکھ لیا کرتا تھا ۔ لیکن جب میں خوبی قسمت سے خود مغربی دنیا میں جا پہنچا تب یہ مغالطہ ختم ہوا ۔ تب کہیں میں نے اس حقیقت پر صاد کیا کہ مغربی دنیا والے تو بالکل مشرق دنیا ہی والے ایسے ہیں ۔ تب یہ دونوں ایک ہی آدم کی اولادیں ہو سکتے ہیں اور ایک ہی قوم کے نہیں ایک ہی صنف کے ہو سکتے ہیں ۔

میں نے جب غور کیا ان فرقوں پر جنھوں نے عوامی دنیا اور خود مجھ کو بھی اس مغالطے میں ڈال رکھا تھا کہ مغربی دنیا اور مشرق دنیا کے بسنے والے علیحدہ علیحدہ جنسیں، قومیں یا صنفیں ہیں تب معلوم ہوا کہ یہ فرق ہرگز اتنے وزنی نہیں کہ ان کی بنیاد پر ان دونوں گروہوں کو علیحدہ علیحدہ قسم مان لینا پڑے ۔ کیا ہیں وہ فرق ؟ وہ فرق یہی تو ہیں ۔

(۱) دونوں کے رنگ الگ الگ ہیں ۔

(۲) دونوں کے ڈیل ڈول الگ الگ ہیں ۔

(۳) دونوں کی زبانیں الگ الگ ہیں ۔

(۴) دونوں کی تہذیبیں یعنی رہنے سہنے کے طریقے الگ الگ ہیں ۔

(۵) دونوں کی ذہانتیں الگ الگ ہیں ۔

(۶) دونوں کے مزاج الگ الگ ہیں ۔

(۷) دونوں کے مذہب الگ الگ ہیں ۔

آئیے ان فرقوں کو ذرا جانچیں اور دو پہلو سے جانچیں ۔ ایک اس پہلو سے کہ آیا یہ فرق موجود بھی ہیں یا محض وہم ہی وہم ہے ۔ دوسرے اس پہلو سے کہ آیا یہ فرق موجود بھی ہیں تب ان کا اثر کہاں تک ہے ؟ پہلے پہلو کی جانچ کا یہ پھل ہے کہ یہ فرق اصل میں موجود بھی نہیں ہیں ۔

(۱) دونوں کے رنگ الگ الگ نہیں ہیں ۔ گورے بھی دونوں دنیاؤں میں بستے ہیں اور کالے بھی ۔ یہ مشرق کے ذیل خطوں والے اتنے ہی گورے لوگ ہیں جتنے مغرب والے کشمیر ، یا غسان، افغانستان، بلوچستان، سنہستان، شامیستان (یعنی شام مع مشرق اردن ، لبنان ، فلسطین) ترکستان، ترکی اور اگر مشرق کے کچھ خطے پورے گورے نہیں ہیں بلکہ گندمی یا قدرے سانولے ہیں تو پوری مغربی دنیا میں بھی پورے گورے نہیں ہیں بلکہ گندمی یا قدرے سانولے ہیں ۔ مثلاً یونان والے ، اسپین والے، فرانس والے ، زیکو سلاویکیا والے۔ اور اگر مشرق کے کچھ خطے والے بالکل کالے بھجنگ ہیں تو مغرب میں بھی

کالے بھجنگ موجود ہیں ، چاہے وہ کہیں کی پیداوار ہوں ، چاہے دو رنگ کے میل جول والوں کے پھل ہوں -

(۲) دونوں کے ڈیل ڈول بھی الگ الگ نہیں - ہر ڈیل ڈول والے دونوں خطوں میں موجود ہیں ، کہاں لمبے نہیں ہیں ؟ کہاں ٹھگنے نہیں ہیں ، کہاں موٹے نہیں ہیں ، کہاں دبلے نہیں ہیں؟ اگر مغرب میں کناڈائی اور انگریز لمبے ہیں تو مغرب ہی میں جرمن اور فرنچ ٹھگنے بھی ہیں - اگر مشرق میں ایرانی اور افغانی ٹھگنے ہیں تو سوڈانی اور ابی سینائی لمبے بھی ہیں -

(۳) دونوں کی زبانیں بھی الگ الگ نہیں ہیں - دونوں خطوں کی زبانیں دونوں خطوں میں بولی جاتی ہیں اور سمجھی جاتی ہیں ، چاہے مصنوعی طور پر اور اکتسابی وجہ سے ایسا ہو گیا ہو -

(۴) تہذیبوں کو دیکھتے ہی پتہ چلتا ہے کہ دنیا بھر کی ایک ہو گئی ہے ، رہی ہوں گی کبھی الگ الگ مگر اب تو نہیں ہیں - مشرق کا کونسا گروہ بچ گیا ہے جو اب کوٹ پتلون نہیں پہنتا اور مغرب کا کونسا گروہ ہے جو ضرورت کے وقت مشرقیوں کی پوشاک اختیار نہیں کر لیتا - میز کرسی، چمچہ کانٹا اور پردے وغیرہ مشرق کے بھی ہر خطے میں پہنچ گئے ہیں ، مشرق میں مخصوص نہیں رہ گئے ہیں - مشرق کے مخصوص کھانے مغرب میں کہاں رائج نہیں ہو گئے ؟ پھر موجودہ مغربی تہذیب ہمیشہ سے مغرب کی نہیں ہے - مغرب میں مشرق ہی سے لی گئی

تھی، ترکستانیوں اور عربوں کے ہاتھوں، پھر مشرق میں لوٹ پڑی ہے ۔

(۵) دونوں کی ذہانتیں بھی ایک سی ہیں ۔ پہلے عرب فلسفی اور موجد تھے جو مشرق لوگ ہیں اور انھیں سے مغربیوں نے فلسفہ اور ایجاد سیکھا اور اب یہ چیزیں مغربیوں سے مشرق سیکھ رہے ہیں ۔ یہ تبادلے کا ایک چکر ہے جو چل رہا ہے ۔ تب ذہانتوں کا فرق نہیں ہے صرف محنتوں کا فرق ہے ۔

(٦) مذہب بھی الگ الگ نہیں ہیں ۔ مغرب کا مذہب کیا ہے، عیسائیت، یہودیت، اسلام ۔ یہ تینوں مذہب مشرق کے بھی مذہب ہیں اور مشرق ہی کے مذہب ہیں جو مغرب میں پھیل کر پہنچ گئے ہیں ۔ دونوں کے مزاجوں میں بھی کوئی فرق نہیں ملتا، اگر وہاں غصہ بہت ہے، جیسا کہ ہالینڈ کے باشندوں میں ہے، تو مشرق میں بھی غصہ بہت ہے ۔ پٹھانوں، ترکوں، عربوں، اور ترکستانیوں کے غصے الامان و الحفیظ ! اگر وہاں علم ملتا ہے جیسا کہ فرانسیوں میں ہے تو مشرق میں بھی علم بہت ہے جیسا کہ مدینہ والوں میں ہے ۔

اگر مان بھی لیجیے کہ یہ فرق واقعی فرق ہیں تب بھی ان کا اثر یہاں تک تو نہیں ہو سکتا کہ دونوں کو دو قومیں کہہ دیا جائے ۔ ایک ہی گھرانے میں یہ سارے فرق موجود ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ان فرقوں کا یہ اثر تو نہیں ہو سکتا کہ ایک

ہی گھرانے والے کو مختلف قوموں کا گروہ کہہ دیا جائے ۔ انگلستان میں میں نے کتنے ایسے گھرانے پائے ہیں جہاں عیسائیت اسلام اور یہودیت تینوں مذہب موجود ہیں اور ساتھ ، ساڑی اور شلوار تینوں پوشاکیں یک جا ہیں ۔ ایک انگریزی بولتا ہے ، ایک عربی ، ایک عبرانی، ایک اردو ، ایک عرب ہے، ایک فلسطینی ہے ، ایک انگریز ہے ایک گورا ہے ، ایک گندمی ہے، ایک سانولا ہے ۔ یہ کیسے ہو سکا ؟ یہ ایسے ہو سکا کہ ایک انگریز گھر کی کئی لڑکیاں کئی قسم کے شوہروں سے بیاہ دی گئی ہیں ۔ ایک انگریز سے دوسرے عرب سے ، تیسری یہودی سے، چوتھی پاکستانی مسلمان سے ۔

پھر ان سب گروہوں کی اصلیت کہاں سے ہے ؟ کا کیشیا سے، جیسا کہ محققوں کے ایک گروہ کی رائے ہے ، یا وسطی ایشیا سے جیسا محققین کے دوسرے گروہ کی رائے ہے ، یا پھر سرادیپ یا کالڈیا سے یا عرب سے ۔ بہرحال ایک ہی جگہ ہے جہاں سے انسان پھیلنا شروع ہوئے ۔ پھر ایک آدم ہی سے ہیں اور ایک نوح ہی سے ہیں ۔ تب مشرق اور مغرب والے اصولی درجے میں الگ الگ قسم کیسے مانے جا سکتے ہیں ۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ موجودہ فرانسیسی قوم صدیوں سے اس کاتھ قوم کی نسل سے چلی آ رہی ہے جو ترکستان سے اٹھ کر اٹلی ہوتی ہوئی فرانس میں جا جمی اور وہاں پھیلی پھولی، تو کوئی کیسے کہہ سکتا ہے اس تاریخی حقیقت کی موجودگی میں کہ مغربی قوم علیحدہ قوم ہے مشرقی قوم سے ، پھر جب موجودہ اسپینی قوم میں عرب قوم کا خون بھی ملا ہوا ہے، تب اس حقیقت کے ہوتے ہوئے کوئی یہ کہنے کی کیسے ہمت کر سکتا ہے کہ مغربی قوم علیحدہ

قوم ہے مشرق قوم سے ، اسی طرح جب کہ یونالیوں کا خون پنجابیوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مشرق قوم علیحدہ ہے مغربی قوم سے ، اور جانے دیجیے پرانی باتوں کو، نئے دور میں جتنا غلط ملط ہے خون کا مشرق اور مغربی قوموں میں اس کی کوئی حد و نہایت بھی ہے اور کیا اس کے بعد بھی مشرق قوم اور مغربی قوم علیحدہ علیحدہ قومیں ٹھہرائی جا سکتی ہیں ؟

تب یہ مشہور بات کہ مشرق اور مغرب کے لوگ علیحدہ علیحدہ لوگ ہیں محض وہم اور مغالطے کی بات ہے اور اس لائق نہیں ہے کہ کم سے کم فلسفے کا علم رکھنے والا اور فلسفیانہ ذہانت کی پونجی رکھنے والا اس رسمی اور جہلی بات کو دماغ کے قریب بھی آنے دے ۔ چنانچہ میں نے تو اس غلط بات سے توبہ کر ہی لیا ہے کیونکہ تاریخ اس ایک داستان کے سوا دوسری داستانوں سے خاموش ہے اور اگر اس ایک داستان کے علاوہ بعض دوسری داستانیں بھی موجود ہیں جیسے ایران میں ہے تو صرف افسانے میں ، یا ناموں کی تبدیلی ہے ۔ اور اب میں اس صحیح بات کو ماننے لگا ہوں کہ انسانی آبادی کا مشرقی گروہ اور مغربی گروہ دو ہرگز قومیں نہیں ہیں ۔ ایک ہی قوم ہیں اور اس لیے دونوں کو ایک ہی قوم کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور اس بنا پر ان کی بناوٹی غیریت، ضدیت، منافرت اور مقادمت کو بھی ختم کر دینا چاہیے اور ان میں یکانگت، اتحادیت ، موافقت اور معاونت کی حالتیں اور کیفیتیں پیدا کر کے ان کے اندر سے ایک عالمی نوعی وحدت قومی کی ہیئت اجتماعی کو برآمد کر لینا

چاہیے - پھر یہی ہیئت اجتماعی کی بنیاد پر عالم انسانیت اور نوع انسانی کی ایک نئی تشکیل کرنی چاہیے جس کی بنیاد تک میں عناد و فساد کی کوئی سمائی نہ رہ جائے اور ان کی جگہ اتحاد و اتفاق اپنی جڑیں جمائیں اور یوں کہ دنیا امن و امان کی دنیا بن جا سکے - ترقی و تکمیل کی دنیا بن جا سکے -

---

ہمارا فلسفہ ، فلسفۂ ربّانیہ اس نظریہ کو نظریہ عالمیت کہتا ہے، جو بنیادی نظریۂ ربّانیت کی ایک فرع ہے ، جو نظریۂ قومیات اور نظریۂ وطنیات کا بالکل مخالف ہے اور جو ان دونوں نظریوں کو جڑ سے ختم کر دینا چاہتا ہے اور جو نظریۂ قومیات و وطنیات والوں کو کم علم، کم فہم اورکم حوصلہ مان کر ان کی پیروی کو گمراہی قرار دیتا ہے ، جو نظریہ عالمیت کو غالب کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے - میں نے اپنی سیاحت میں دنیائے مغرب کو جو علم سکھانا چاہا اور جو کچھ سکھایا اس کا ایک شوشہ نظریۂ عالمیت بھی تھا اور اب میں اسی شوشہ کو دنیائے مشرق کو سکھانے کی آرزو رکھتا ہوں - میری تحریک ربّانیت کا ایک مقصد اور ایک کام یہ بھی ہے- رب العالمین اس کو مقبولیت عطا فرمائے -

---

میرا نظریۂ عالمیت سیاحت مغربی سے پہلے بھی تھا لیکن فکری درجے سے آگے نہ تھا اور ذوقی درجہ میسر نہ تھا - یہ ذوق کہتا تھا کہ فیلسوف صاحب تمہارا نظریہ عالمیت کہیں صرف شاعری نہ ہو-

سیاحت مغرب نے میرے اس نظریہ کو ذوق کا درجہ بھی دے ڈالا۔ اب میں اس نظریے اور مسئلے کو یا یوں کہیے کہ اس بات کو ذوق اور اعتقاد کے رنگ میں بھی ماننے لگا۔

اس سیاحت میں میرے تخیل نے نہیں میری آنکھوں نے دیکھا کہ گورے کالے اس زندگی کے کارخانے میں اسی طرح مل جل کر چل رہے ہیں اور معمولی سے معمولی تفریق اور تعصب کے بغیر زندگی کی لہروں پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بہے چلے جا رہے ہیں، جس طرح ایک کارخانہ میں اس کے تمام کارکن مل جل کر چلتے ہیں اور کام میں آنکھیں بند کرکے ڈوبے رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کالوں کی گوری بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ اسی طرح دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ زندگی کاٹ رہی ہیں جس طرح گوروں کی گوری بیویاں شوہروں کے ساتھ کاٹ رہی ہیں۔ اسی طرح میں نے دیکھا کہ کچھ گوری دو شیزائیں کالے معشوق مردوں کے پیچھے تعشق و تولا کی تحریک کے زور میں اسی زور و شور سے دوڑ رہی ہیں۔ یہ چیزیں میں نے ہپالستان (ہندوستان و پاکستان) کے تنگ میدان تعصب و تکلف میں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور اب کہ دیکھی نہیں تھیں تب میرے تخیل عالمیت و وحدت قومیت انسانی کو ذوقیت کی کیفیت کہاں میسر آ سکتی تھی۔

پھر میں نے گوروں اور کالوں کے تعشقی اور ازدواجی جوڑوں سے جرحی قدحی گفتگوئیں کرکے ان کے قلبی رابطوں کی بھی جانچ کر لی اور پوری تسکین کر لی کہ یہ رابطے محض ضروریات اور

حاجت کے رابطے نہیں رہ گئے تھے جو دلوں کی تہوں تک تیرے نہیں تھے بلکہ وہ تقاضاے قلوب کی اصابت و صداقت کے رابطے بھی بن چکے تھے جو دلوں کے رگ و ریشے تک پہنچے ہوتے ہیں ۔

پھر میں نے دیکھا کہ کالے طالب علموں اور گورے استادوں میں بھی حقیقی قلبی رابطے قائم تھے ۔ میں نے عبدالواحد سندھی صاحب، طالب علم آکسفورڈ یونیورسٹی اور ان کے استادگب صاحب کے درمیان اس اتحادی رابطے کا کھلا ہوا مشاہدہ کیا ۔ پھرکیمبرج کے ایک رئیس زادے ٹفٹن اور ان کے معنوی استاد چودھری رحمت علی پنجابی صاحب کے درمیان اس قلبی رابطہ کا مطالعہ کیا ۔ پھر میں نے خود اپنا حال دیکھا ، اپنی ان ملاقاتوں میں جو گورے پروفیسروں سے کیں اور یہ دیکھا کہ مجھ کالے کے ساتھ ان گوروں کے وہی تپاک تھے جو کالوں کے ہو سکتے تھے ۔ پھر ان مجلسوں میں جو گوری عورتوں میں اور مجھ میں برپا ہوئیں ، ان مجلسوں میں سے ایک مجلس کا خصوصی تذکرہ کر دوں تا کہ اس مقدمے کے پڑھنے والوں کے سامنے میری اس داستانی بات کی پوری تصویر سامنے آ جائے ۔ لندن کے ایک گوشہ میں میری اور ایک گوری عورت کے درمیان اسی کے گھر میں ایک مجلس مباحثہ برپا ہوئی اس مسئلے پر کہ خدا کا وجود عقلی دلائل سے ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ یہ مجلس پوری رات قائم رہی صبح صادق کو پھوپھٹنے تک میں نے اس مجلس میں آنکھوں سے دیکھا صرف تخیل سے سوچا نہیں کہ یہ گوری عورت مباحثہ کی سرگرمیوں میں بھی میرے بڑھاپے کا لحاظ کرکے مجھے ٹھنڈ سے بچائے رہنے کے لیے بار بار اس کمبل کو جو

میرے پیروں پر پڑا ہوا تھا اور مباحثے کی گرمی میں پیروں سے کھسک کھسک جاتا تھا ، لپک لپک کر میرے پیروں پر اس جوش سے ڈالتی رہتی تھی گویا میرے پیر اسی کے پیر ہیں اور میرا وجود اسی کا وجود ہے اور سنیے کہ یہ مجلس میرے اور اس عورت کے سوا تیسرے وجود سے بالکل خالی تھی اور خدا اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی مجلس کا تماشہ کرنے والا نہ تھا ۔

اب بتائیے میں اس اتحادی و رواداری منظر کو دیکھ کر یہ کیسے نہ مان لیتا کہ میں اور وہ گوری عورت ایک ہی قوم سے ہیں اور میرے اور اس کے عوارضی فرق اتنے ہی سطحی اور بے حقیقت ہیں جتنے سطحی اور بے حقیقت وہ فرق ہیں جو پوشاکوں کے اختلاف سے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ بے شک میرے اور اس عورت کے درمیان رنگوں کا فرق تھا ۔ وہ گوری میں کالا ۔ یا پھر دو زبانوں کا فرق تھا ، اس کی مادری زبان انگریزی میری مادری زبان اردو اور میری وہ اکتسابی زبان جس کو میں مباحثے میں استعمال کر رہا تھا یقیناً شکستہ اور ریختہ ۔ مگر کیا یہ فرق میری اور اس کی وحدت قومی کے رابطے میں ذرا بھی بل اور خلل لا سکے ؟ یہ تو عورت کا معاملہ ہے جس کی بابت آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو ایک نرم نرم اور پگھلی پگھلی مخلوق ہے ۔ اچھا اب سنگین گورے مردوں کی بعض ملاقاتوں کا حال سنیے ۔ میں اسٹوری صاحب استاد کیمبرج یونیورسٹی سے ملا ۔ وہ واللہ میرے سامنے اس طرح بچھے جا رہے تھے گویا وہ میرے نوکر ہیں اور میں ان کا آقا ہوں ، دراں حالیکہ اجتماعی حیثیت سے میں ان کا غلام اور وہ میرے آقا تھے ۔ پھر میں

ب گب صاحب استاد آکسفورڈ یونیو رسٹی سے ملا اور اثنائے
حبت میں ان سے پینے کا پانی مانگا تو وہ اپنے شاگرد عبدالواحد
ندھی صاحب کو روک کر خود پانی لائے اور کھڑے ہو کر پیش
یا ۔ پھر ہوٹل میں اس ڈھنگ سے کھانا کھلاتے رہے گویا وہ
برے خانساماں یا خدمت گار ہیں ۔

کیا اتنی مثالیں کافی نہیں یہ سمجھانے کے لیے کہ حقیقت کی
نیا میں گورے اور کالے ایک ہی قوم عالمی کے لوگ ہیں اور جو
تفریق قومی تفریق کے نام سے ان کے درمیان حارث ہو گئی ہے وہ
حبت محض بناوٹی ہے، بالائی ہے ، جس کو جہالت نے گھڑ ڈالا ہے
ر سیاست نے اور حق یہ ہے کہ یہ بناوٹی اور بالائی تفریق یکسر
ر سراسر ختم کر دی جائے اور آج نہ سہی کل ختم کر دی جائے ۔
سوس کہ سفر نامہ اور وہ بھی اس کا مقدمہ اس سے زیادہ تفصیلوں
متحمل نہیں ہے ورنہ اس مسئلہ پر بلا تکلف تفصیلوں کا اونچے سے
نچا انبار لگا دیا جا سکتا ہے ۔

(سفر نامہ ربانی ، ص ۱۰۴ - ۱۷۷)

مغرب کی انفرادیاتی علاقائی خصوصیتیں

مغرب کی مجموعیاتی خصوصیتیں تو ذکر میں آ چکیں، اب کچھ علاقائی انفرادیاتی خصوصیتیں بھی مذکور ہو جائیں تو بہتر ہے ۔

انگلستان

انگلستان سے ہماری مراد یہاں چھوٹا انگلستان نہیں ہے جو انگریزوں کے مجموعی علاقہ برطانیہ کا صرف ایک جز ہے جس کے مد مقابل دوسرے اجزاء بھی ہیں ۔ مثلاً اسکاچستان، ویلزستان، آیرستان۔ ہماری مراد یہاں بڑا انگلستان ہے جو پورے علاقہ برطانیہ کو اپنے بازووں میں لپٹے ہوئے ہے جس کے معنی میں اسکاچستان، ویلزستان آیرستان اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل ہیں ۔ اس بڑے معنی میں انگلستان کی علاقائی خصوصیتیں یہ ہیں :

(۱) انگلستان پورے مغرب میں ، جس میں امریکہ بھی شامل ہے زیادہ خود دار زیادہ سنجیدہ زیادہ لیے دے ہوئے ہے ۔

(۲) انگریز زیادہ متین ہے ۔ انگریز کم بولتا ہے ، کم ملتا ہے ، کم بکھرتا ہے ، خوشی کے وقت بھی اپنے کو لیے دے رہتا ہے بکھرتا نہیں دکھائی دیتا ۔ غم میں بھی اپنے کو لیے دیے رہتا ہے اور شور و شیون نہیں کرتا ۔

(۳) انگریز کی بات کا وزن بھی زیادہ ہوتا ہے ۔ انگریز کا ایک فقرہ تو فرانسیسی کی ایک پوری تقریر ۔

(۴) انگریز کے بعد میں تو جرمن ہی سے زیادہ متاثر ہوا ہوں ۔

(۵) انگریز کم بخت تو یہ سمجھیے کہ ایک سنگی بت کی طرح ہے ۔ مشرق میں کبھی عرب اس خوبی کا مالک تھا ۔ اب صرف ترک ہے ۔ مگر انگریز اس خوبی میں ترک سے بھی ایک آدھ درجہ زیادہ ہے جیسا کہ جرمن سے ایک دو درجہ زیادہ ہے ۔

(٦) انگریزوں میں برداشت کی قوت بھی سارے مغربیوں سے زیادہ ہے ۔ انگریز مصیبت میں سارے مغربیوں سے زیادہ شاداب دکھائی دے گا ۔ اسی لیے وہ ٹھنڈے دماغی مقابلوں میں بھی اور گرم و تند لڑائیوں میں بھی ہارتے ہارتے جیت جاتا ہے اور پوری دنیا اس کی آخری جیت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے ۔

(۷) انگریز چمیڑ بہت ہے ۔ کوئی چمیڑ پنے میں انگریز سے آنکھ نہیں ملا سکتا ۔ مشرق میں اس خصوصیت میں بھی انگریز کا جواب صرف ترک بچ گیا ہے ۔ اسی لیے انگریز لڑائی میں کبھی کبھی ترک سے ہار جاتا ہے ، مگر ترک کا چمیڑ پن صرف لڑائی کے میدان میں ہے فکر کی مجلس میں نہیں ہے ۔ اسی لیے ترک دماغی مقابلے میں انگریز سے ہمیشہ ہارا گیا ۔ البتہ ترک کچھ عرصے سے دماغی چمیڑ پن کو بھی حاصل کرنے کی فکر میں ہے ۔

(۸) انگلستان میں فلسفیت عامہ بھی سارے مغربیوں سے زیادہ ہے۔
زندگی کے واقعاتی، عملیاتی فلسفے کو انگریز خوب جانتا ہے،
اسی لیے جرمن اگرچہ علمی زندگی میں تو انگریز کو سو برس
پڑھائیں، عملی زندگی میں انگریز کے شاگرد ہی رہتے ہیں۔ پھر
طرہ یہ ہے کہ جرمن انگریز سے محنتی بھی کہیں زیادہ ہے۔ لہو و
لعب اور تفریح و تنشیط سے جرمن اتنے ہی دور رہتے ہیں جتنا
مشرق کا شوقین طالب علم مولوی اور سچا صوفی کبھی رہتا
تھا۔ گویا جرمن مغرب کے مولوی اور صوفی ہیں اور انگریز
جرمنوں کے مقابلے میں علی گڑھ کا کھلنڈرا سمجھا جاتا ہے۔

(۹) جرمنوں کو اپنی محنت گردی اور انگریز کی لہو پرستی کو
دیکھ کر کچھ دنوں دھوکہ بھی رہا کہ اب انگریز چلے اور
تخت امامت ہمارے لیے بچھا۔ چنانچہ ایک جرمن چانسلر ڈاکٹر
بیتھمن ہالو نے یہ بات زبان سے ایک دفعہ نکال بھی دی اور
قیصر اور ہٹلر اسی رائے کی بنا پر انگریز پر چڑھ دوڑے،
مگر دو ہاریں کھانے کے بعد جرمنوں نے غالباً اس دھوکے سے
نجات پا لی ہوگی اور یہ بات سمجھ لی ہوگی کہ محنت ہی سب
کچھ نہیں ہے، جیسا کہ علم خصوصیات ہی سب کچھ نہیں
ہے بلکہ تفریح و تنشیط بھی ایک چیز ہے جیسا کہ علم عمومیات
بھی ایک چیز ہے۔

(۱۰) انگریز کی تفریح و تنشیط بھی اس کی جیت کے سبب میں سے
ایک ہے۔ اسی طرح اس کا علم عمومیات اور دوسرے لفظوں
میں فلسفیت عامہ اس کی کامیابی کی کنجیوں میں سے ایک ہے۔

(۱۱) انگلستان میں جذبہ انائیت بھی سارے مغربیوں کے اوپر ہے۔ کوئی مغربی بھی اصالتی طور پر افضل العالمین نہیں مانتا نہ افضل العالمین بننا چاہتا۔ اسی لیے سارے مغرب میں زمانہ عروج کے مسلمانوں کے منہ چڑھنے کی اگر کسی نے ہمت کی تو وہ صرف انگریز تھے۔

(۱۲) روسی اور فرانسیسی بھی منہ آئے مگر روسی مسلمانوں کے زوال کے وقت آئے۔ فرانسیسی انگریزوں کے سہارے آئے۔ خود مسلمان بھی انگریزوں سے زیادہ جھنکتے رہے، صلاح الدین ایوبی تک کو فتح کے باوجود انگریزوں کے سامنے جھکنا پڑا اور دبی ہوئی صلح کرنا پڑی۔ پھر آخر انگریزوں نے ہی مسلمانوں کو پورا پورا توڑ بھی دیا اور شائد اب تک توڑتے چلے جا رہے ہیں۔

(۱۳) انگلستان ذہانت میں فرانس کے علاوہ پورے مغرب سے آگے ہے اور اب تو شائد اور شائد کیا یقیناً فرانس سے بھی آگے ہو۔ فرانس کی ذہانت شائد غیر معتدل عیاشیوں کے ہاتھوں کچھ زنگ خوردہ ہو گئی۔

(۱۴) انگلستان پورے مغرب میں حسن شاہانہ کے اعتبار سے زیادہ حسین بھی ہے جیسا کہ زیادہ ذہین ہے۔ اگرچہ حسن معشوقانہ کے اعتبار سے اسپین اور یونان سے پیچھے ہے۔ حسن میں عام شہرت فرانس اور اٹلی کی زیادہ ہے، لیکن یہ شہرت عامیانہ ہے فلسفیانہ نہیں ہے۔ مگر انگلستان حسن کلی و مجموعی میں

جواب نہیں رکھتا ۔ انگریز حسین عورت چاہےایک ایک جزو میں فرانسیسی ، جرمن ، اطالوی ، اسپنی، یونانی حسین عورت سے گھٹیا پڑے ۔ لیکن مجموعی اور کلی حیثیت سے اس کی یہ مثال ہے کہ وہ ملکہ دکھائی دے گی اور باقی اسی کی باندیاں نظر آئیں گی ۔ عرب تو انگریزی حسینہ کی صرف رشاقت قد پر مرتے ہیں لیکن میرا کلیت پسند دماغ انگریزی حسینہ کی ملکویت سے متاثر ہے ۔ میں فرانس میں بھی بہت شگفتہ تھا ، جہاں کہتے ہیں کہ صرف حسین ہی رہتے ہیں ، جہاں کی نسبت کہا جاتا ہےکہ وہاں حسن ہی ابلتا ہے اور برستا ہے جیسا کہ شراب ابلتی ہے اور برستی ہے ۔ لیکن میں صرف مرعوب انگلستان ہی میں ہو سکا کیونکہ حسن کی ملکائیں صرف انگلستان پیش کر سکا ، فرانس نہیں اور فرانس ہی پر کیا موقوف ہے کوئی مغربی ملکہ نہیں اور مشرق تو یہ جنس رکھتا ہی نہیں ۔

(۱۵) انگلستان میں عشق بھی ہے مگر مجنونانہ نہیں ہے فرزانگانہ ہے ۔ اسی لیے پوری انگریزی تاریخ صرف ایک مجنوں کو پیش کر سکی ، یعنی ان شاہزادے صاحب کو جو پہلے بادشاہ تھے ، اب صرف شہزادے ہیں اور متشکیکین حضرات ایک تو ان مجنوں صاحب کے بھی مجنوں ہونے میں شک فرماتے ہیں ۔ یہ بھی انگلستان کی ایک خوش قسمت ہے ۔ جن ملکوں میں عشق مجنونانہ پیمانے کے پائے جاتے ہوں یقین کیجیے کہ وہاں یا تو پہلے سے حضرت مجنوں تشریف فرما ہیں یا آئندہ قدم رنجہ فرمانے والے ہیں ۔

مشرق کو جن چیزوں نے تباہ کیا ان میں سے ایک چیز مجنونانہ عشق کی خصلت بھی تھی بہتات کے ساتھ۔

(۱۶) انگلستان کی سیاسی قابلیت کا کیا کہنا اور ہمیں اس پر کچھ کہنا بھی نہیں ہے۔ انگلستان کی سیاسی قابلیت سورج کی طرح ہے جس کو ہر شخص دیکھتا ہے اور بہ قدر لیاقت پہچانتا بھی ہے۔

(۱۷) اس نے ابھی پچھلی جنگ میں نازی جرمنی اور اشتراکی روس دونوں کو پچھاڑ دیا۔ نازی جرمنی کو تو تباہ ہی کر دیا۔ اس کے بعد اب جرمنی شائد ہی کبھی سر اٹھائے۔ لیکن اشتراکی روس کو بھی اتنا زخمی کر دیا ہے کہ وہ بھی دیر ہی میں پنپ سکتا ہے۔ اس نے سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ ترکی کو روس سے چھین لیا۔ جس کے سبب اسلامی دنیا کا روس کی صف میں جانا صدیوں کی دیر کی بات ہوگئی۔ پھر اس کو جرمنی میں بلا کر طویل المحدود بنا دیا۔ عرب تو خیر اب بچے سے زیادہ نہیں رہ گیا ہے۔ عرب کو ترکی سے پھاڑ کر اس کو تو اس نے صدیوں تک کے لیے کہیں کا نہ رکھا۔ البتہ ایک ترک اس کے برابر کا حریف ہے۔ مگر ترک بھی ابھی تک سنبھلنے نہیں پا رہا ہے۔ ترک کا معاہدہ سعد آباد پرزے پرزے ہو چکا۔ ترک کا معاہدۂ بلقان بھی دم توڑ چکا۔ عرب کی طرف ترکی کا کوئی قدم خود عرب کی تنگ دلی سے سرسبز ہونے نہیں پاتا۔ لیکن خیر ترک بھی ابھی تک ہمت نہیں ہارا ہے۔ اس نے امریکہ کو مضبوط

پکڑا ہے ۔ شاید یہیں سے اس کو کوئی راستہ مل جائے ۔ لیکن یہ بھی ایک دھندلی سی چیز ہے ۔ بہرحال ترکی کے سوا سیاست میں انگلستان کا کوئی طاقتور حریف نہیں ہے اور اگر کہیں ترکی روس کو مل جائے تو بس پھر ترکی کے غلبے کی بھی امید کی جا سکتی ہے ۔ مگر روس سیاست میں اتنا ذہین نہیں ہے کہ اس کی امید باندھی جائے ۔ روس میں اشتراکی ذہانت ضرور موجود ہے مگر روسی علاقائی عناد بھی اب تک روس سے لپٹا ہوا ہے ۔ ہاں چینی ذہانت سے تھوڑی سی امید باندھی جا سکتی ہے ۔ مگر چین اور روس کی سرحدیں نہیں ملتیں ۔

(۱۸) انگلستان میں شجاعت بھی مغرب بھر سے زیادہ ہے فرانس اور جرمنی بھی بہت شجاع ہیں ۔

(۱۹) انگلستن کی آخری خصوصیت جس میں وہ پورے مغرب پر بھاری ہے اس کی قابلیت مطابقت ہے ۔ انگریز پانی کی خاصیت رکھتا ہے جس ظرف میں ڈال دو اس ظرف کی شکل اختیار کر لے گا ۔ انگریز نے اس خاصیت کی بدولت بھی اپنے بڑے بڑے انہونے منصوبے پورے کر لیے اور وہ کرامتیں دکھائیں جن کو کامل صوفی بھی نہ دکھا سکے۔ اسی خاصیت کی بدولت انگریزوں نے عربوں کو ترکوں سے ایسا پھاڑ دیا کہ ترک اور عرب اب شائد قیامت ہی میں ملیں تو ملیں ۔

(۲۰) کپتان شیکسپیر اور کرنل لارنس نے وہ عربیت پیدا کی کہ عرب یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ انگریز عیسائی ہیں ، دشمن اسلام

ہیں ، حریف مسلمین ہیں ، انگریز کا وظیفہ جپنے لگے اور انگریزوں کے لیے تخت امامت بچھانے لگے۔ کرم شاہ نے جن کا انگریزی نام مجھے یاد نہیں رہ گیا افغانیت میں وہ کمال پیدا کیا کہ افغانیوں نے ان کے ایک اشارے پر افغانستان کی بوٹی بوٹی کر ڈالنے سے اس وقت تک ہاتھ نہیں روکا جب تک نادر خان نے فرانس سے افغانستان آکر ان کے ہاتھ نہیں باندھ دیے حتی کہ ملا شور بازار جیسے مقدس شخص بھی کرم شاہ کے اشارے پر ناچ اٹھے اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجوا دینے میں فرشتہ کرم شاہ کی کارندہ گری کرنے لگے ۔ ہمالستان کی تباہی کا تو قصہ بہت پرانا ہے مگر انگریز کی خاصیت مطابقت کی تعریف کے سلسلے میں اگر اس کو بھی ایک دفعہ یاد کر لیجیے تو کیا مضائقہ ہے ، کیونکہ ہمالستانی مسلمان بھی ہر جگہ اور ہر منزل میں انگریز کے ساتھ ہو جاتے تھے اور ان کے اشاروں پر خود اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتے تھے ۔ میر جعفر ، میر صادق ، علی نقی ، الٰہی بخش اور ایسے ہزاروں اسی یقین میں پھنسے کہ انگریز بہترین مسلمان ہیں اور یہی وہ ہیں جن کے قدموں کے نیچے دنیا اور عقبی دونوں جگہ کی بہشتیں ہیں ۔ آج ہندو بھی اسی چکر میں ہیں جس میں پہلے مسلمان پڑے تھے مگر ابھی ان کو بھی ہوش نہیں آئے گا ۔ جیسا کہ پہلے مسلمانوں کو نہیں آیا تھا ۔ ہم تو یہاں تک جانتے ہیں کہ خود امریکی بھی اسی چکر میں ہیں ۔

(۲۱) انگریز کا قلندر امریکی بندروں کو بھی اسی طرح نچا رہا ہے ۔

جس طرح مداری بندروں کو نچاتا رہا ہے اور نچا رہا ہے - پھر ہم اس سے بھی آگے جانے کی ہمت کر سکتے ہیں - ہمیں تو یہاں تک خطرہ ہے کہ ایک دن انگریز قلندر روس اور چین کو بھی بندروں کی طرح نچانے نہ لگے -

(۲۲) مصر میں انگریز نے اپنے کارندے جنرل نجیب کے ہاتھوں فاروق ، نحاس ، مفتی فلسطین اور اخوان المسلمین کا سب کا خاتمہ کروا دیا جو روس کے مہرے تھے - ایران میں مصدق اور کاشانی عنقریب لوٹ جانے والے ہیں - ہندوستانی اور پاکستانی بے چارے کس شمار ہی میں ہے -

(۲۳) ہندوستان میں کانگریس اور سوشلسٹ کی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہیے - انھوں نے اگر اشتراکیت کا بیج بھی باقی رہنے دیا ہو تو میری گردن اور ہر شخص تلوار ، یہاں بابا گاندھی کا وہ باموقع نعرہ ہے اور اب تو آرہندو کا نعرہ بھی لتھی ہو گیا ہے کہ اسٹالن بے چارے تو اسٹالن اگر لینن مع ٹراٹسکی اور خود مارکس مع انجلس کے ۷۰ فی ہزار بار مندروں کا بے کرما بھی کر جائیں تو ہندو کمیونزم کے پاس نہیں پھٹکے گا - یہ اوتار پرست گروہ دو اوتاروں گاندھی اور آربندوں کو پا چکا اب اس کو حقیت سے کیا سروکار - مسلمان کو ایک ہوا دے دی گئی کہ کمیونزم آیا اور تیری نماز اور داڑھی گئی - بھلا اب وہ کہاں سنتا ہے - انگریز تیری جے ، انگریز تیری جے ، رہے پاکستان صاحب تو وہ ہندوستان سے بھی پانچ منزل آگے ہیں -

(۲۴) عرصے سے عالم اور پیر کا یہ بنیادی عقیدہ بن گیا ہے کہ انگریز جبریل کا ناسوتی پیکر ہے اس لیے انگریز کا ہر کلام الہام اور انگریز کا ہر انتظام سعادت دارین کا پیام - اس لیے اگر انگریز روس اور کمیونزم کا مخالف ہے تو روس اور کمیونزم کے مردود دارین ہونے میں شک کرنا بھی کفر ہے -

(۲۵) پاکستان میں روس اور کمیونزم کی ناکامیابی ہندوستان سے بھی زیادہ یقینی ہے الا یہ کہ یہ دونوں پنجۂ انگلستان سے رہا ہو جائیں - دماغی اثر کے لحاظ سے بھی جیسا کہ سیاسی قبضے کے لحاظ سے -

(۲٦) یہاں ایک گرہ کا کھول دینا بھی ضروری ہے جو میرے اوپر کے کلام سے پڑ سکتی ہے - میں نہ انگلستان یا انگریز کا مخالف ہوں نہ روس اور روسی کا عاشق ہوں کیونکہ میں تو ربانی ہونے کی وجہ سے عالمی شخص ہوں - میری نظر میں انگلستان اور روس اور انگریز اور روسی کی برابر کی قیمت ہے - ان میں سے جو ترقی کرے اس سے خوش ہوں اور جو انسانیت کو فائدہ پہنچائے اس کے لیے میری دعا ہے - مجھے اشتراکیت یعنی کمیونزم سے دلچسپی ضرور ہے - ہمدردی بھی ہے - اس کی تھوڑی سی خدمت بھی کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہنا چاہتا ہوں یہ سمجھ کر کہ وہ نیم ربانی چیز ہے اس کی ترقی عین ربّانیت کی ترقی ہے اور عین انسانیت کی ترقی ہے - لیکن میری دلچسپی اس سے اتنی مجنونانہ یا اعتقادیانہ نہیں ہے کہ

اگر کبھی وہ مرنے ہی پر تل جائے تو میں اس کی لاش سے
لپٹ کر زندگی کاٹ دینے یا سوگ میں جان دے دینے کا عہد
کر لوں ۔ میری اس درجے کی دلچسپی کی چیز صرف میری
اپنی تحریک تحریک ربّانیت ہے اور بس ۔

فرانس

فرانس کی علاقائی خصوصیتیں انگلستان کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہیں جن کو بتانے کے لیے بہت مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے :

(۱) فرانس کی ایک خصوصیت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مغرب کا سب سے زیادہ سرسبز اور پھلوں والا علاقہ ہے ۔ فرانس میں جتنے پھل دیکھو گے شائد کہیں نہ دیکھو ۔

(۲) شائد اسی وجہ سے فرانس کی دوسری خصوصیت یہ کہ وہ ارضی حالات کے اعتبار سے مغرب کا سب سے زیادہ حسین علاقہ ہے پھر انسانوں کے اعتبار سے بھی بہت حسین علاقہ ہے اور بعض جزئی خصوصیات حسن کی رو سے حسین ترین علاقہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔

(۳) فرانسیسی عورت کی دُرّی آنکھ مغرب ہی میں نہیں پوری دنیا میں شام کے سوا کسی علاقے سے بھی مقابلے کے لیے پکاری نہیں جا سکتی، شامی آنکھ کی طرح فرانسیسی آنکھ بھی موتی چور آنکھ ہے اس کو یہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی چور کرکے آنکھ میں بھر دیے گئے ہیں ۔ پھر فرانسیسی عورت کا سینہ معلوم ہوتا ہے شیر کا سینہ ہے اور حسن کے

اس پہلو میں بھی فرانس کا مغرب میں کوئی جواب نہیں اگر
اداؤں کو بھی متعلقات حسن کی فہرست میں شامل کیا
جا سکتا ہے تو فرانسیسی عورت مغرب ہی نہیں پوری دنیا
میں حسن کی اکیلی رانی ہے جیسا کہ خوشبو کے لحاظ سے
پھولوں میں رات کی رانی ہے۔

(۴) فرانس علم ادب اور فن مجسمہ سازی میں بھی اپنا جواب نہیں
رکھتا شائد یونان کی یہ دونوں چیزیں فرانس ہی میں پوری
شان سے منتقل ہوئیں۔ فرانس کے خوبصورت مجسمے دیکھ کر
حیرت ہو جاتی ہے کہ انسان ان کو کیسے بنا سکے۔

(۵) فرانس تہذیب میں بھی امتیاز کی شان رکھتا ہے اور ایسی
شان رکھتا ہے کہ اس کو مرکزیت کی شان کہہ سکتے ہیں۔
تہذیب فرانس ہی میں ترشتی ہے۔ فرانس ہی میں پلتی ہے۔
فرانس ہی سے پھلتی ہے اور اگر کچھ گوشوں اور شوشوں
کے اعتبار سے کسی دوسرے مقام میں ترشی بھی گئی تو
فرانس ہی میں سند والی بنتی ہے فرانس گویا یورپستان کا دہلی
اور لکھنؤ والا علاقہ ہے۔

(۶) فرانس بہادری میں لا جواب تو نہیں ہے مگر انگلستان اور
جرمنی کے سوا اس صفت میں کوئی تیسرا مقابل بھی نہیں
ہے۔ جہاں تک دیار مغرب کا تعلق ہے مشرق میں صرف
ترک اس سے آگے ہے اور مغرب میں جرمن اور انگریز اس
کے برابر ہے۔

(۷) فرانس خوش اخلاق میں عالم ، مغرب کا امام ہے۔ پوری دنیائے
مغرب میں گھوم جاؤ لیکن فرانسیسی خوش اخلاق نہیں ملے
گی ۔ ایک اجنبی فرانسیسی سے ملو پہلی ہی ملاقات میں معلوم
ہوگا کہ وہ تمھارا خاندانی دوست ہے ۔ باتیں بھی بہت کرے
گا لاڈ پیار بھی بہت کرے گا ۔ عملی خوش اخلاق میں فرانس
کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے نہ کچھ سماسی ہے لیکن
ترکی کو ذاتی تجربے سے جانتا ہوں کہ وہ دنیا میں سب سے
اونچی ہے حتّی کہ عرب سے بھی اونچی ہے ۔

(۸) فرانس ادبی اور نظری ذہانت میں بھی مغرب میں اپنا جواب
نہیں رکھتا ۔ اس صیغے میں انگلستان اور جرمنی تک اس کے
شاگرد ہیں۔ اشترا کی فلسفے کی بنیاد بھی فرانس میں پڑی تھی۔
مارکس بھی ابتدا کے لحاظ سے فلسفۂ اشترا کیت میں فرانس
ہی کا شاگرد ہے ۔ لینن کو بھی فیلسوف اشترا کیت ہونے
میں فرانس کی سند کی احتیاج پڑی تھی اور جب فرانس سے
سند مل گئی تب وہ فلسفۂ اشترا کیت کا مسلم فیلسوف
مانا جا سکا ۔

افسوس ہے کہ میں نے مغرب میں انگلستان اور فرانس کے سوا
دوسرے علاقے اپنی آنکھوں نہیں دیکھے ، اس لیے مجھے حق نہیں
ہے کہ میں مغرب کے دوسرے علاقوں کی بابت ایک حرف کہوں ۔
سوئزرلینڈ اور اٹلی کے سرحدی مقامات تو دیکھے مگر ان کی مرکزی

جگہیں نہیں دیکھ سکا ۔ کیوں ایسا ہوا ؟ اس کی صرف یہ وجہ ہوئی کہ انگلستان نے پروانہ راہ داری نہیں دیا ۔ مجھے اپنی سیاحت مغربی کے ادھورے ہونے کا قلق بھی ہے مگر مشیت ربی کے فیصلے کے سامنے چارہ کیا ؟ پھر بھی جرمنی کو ایک جرمن خاتون کے ذریعے سمجھنے سے محروم نہیں رہا ۔ اس جرمن خاتون سے مصر میں ملاقات ہوئی اور میں نے اس کی شخصیت میں گویا پوری جرمنی کو زیارت کر لی ۔ یہ خاتون چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی یعنی گریجویٹ تھی اور پیرس یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی اس لیے یہ بھی گمان کرتا ہوں کہ وہ جرمنی کی پوری نمائندگی کرسکی ہوگی ۔ اس خاتون کا حال اور اس کی ملاقات اور گفتگو سے میں جرمنی کو جو کچھ سمجھ سکا اس کا حال اصل سفرنامے میں بیان کروں گا یہاں نہیں ۔

امریکہ

(۱) امریکہ جغرافیائی اعتبار سے تو مغرب کا کوئی خاص جز نہیں ہے اس لیے کہ وہ ایک مستقل دنیا ہے اور ایسی دنیا کہ اگر اس کا ایک سرا مغرب سے ملتا ہے تو دوسرا سرا مشرق سے ملتا ہے۔ امریکہ مغرب کے ایک بڑے سمندر بحراوقیانوس کے کنارے پر بھی ہے اور مشرق کے ایک بڑے سمندر بحرالکاہل کے کنارے پر بھی ہے۔ پھر وہ خود براعظم بھی ہے اور ایسا براعظم جو دو براعظم سے مل کر بنا ہے۔ ایک براعظم شمالی امریکہ ہے دوسرا براعظم جنوبی امریکہ ہے، لیکن تہذیبی اور صنفی اعتبار سے امریکہ مغرب ہی کا ہے اور مغرب ہی کا ایک جز ہے۔ امریکہ کی اصلی آبادی اب اہل مغرب ہی کی ہے۔ امریکہ پہلے امریکہ کے صرف اصلی باشندون سے آباد تھا جن کو اہل مغرب کی طرف سے سرخ ہندوستانی کا نام دے دیا گیا ہے لیکن جب سے مغرب والوں نے اصلی باشندوں کو ہرا کر امریکہ پر قبضہ کر لیا تب سے امریکہ مغربیوں کی ہی بستی بن گیا اور سچ پوچھیے تو اب وہ تنہا مغربیوں ہی کی بستی ہے۔ اصلی باشندے تو ایک علاقے میں گھیر دیے گئے ہیں۔ جہاں وہ صرف ختم

ہو جانے کے لیے جی رہے ہیں ۔ میں نے امریکہ میں ان غریبوں کی زیارت کی کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

(۲) امریکہ میں مغربیوں کے ساتھ ساتھ افریقی بھی دوش بدوش آباد ہیں ۔ یہ اصلی امریکنوں سے تو بہتر حالت میں ہیں اور کہیں بہتر حالت میں ہیں ، پھر بھی مغربیوں کی برابری ان کو حاصل نہیں ہے ۔ یہ پہلے غلام تھے ۔ ابراہیم لنکن کی کوشش سے آزاد ہوگئے ، پھر بھی برابری نہیں پا سکے ۔

(۳) ان میں برابری کا درجہ پا لینے کی تحریک بھی جاری ہے مگر وہ ابھی اس درجے میں نہیں پہنچی کہ کہا جائے کہ اس کا پھل قریب ہے ۔ یہ لوگ کالے کہے جاتے ہیں جب کہ مغربی گورے کہے جاتے ہیں ۔ ان کو کالے کہے جانے کا دکھ ہے مگر یہ دکھ ملتا نہیں ہے ۔ ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں مذہب کے لوگ ہیں ، مگر مسلمان بہت ہی تھوڑے ہیں ۔ مگر ان میں مسلمان ہو جانے کا کافی میلان ہے اور کیا عجب ہے اگر دنیا کے مسلمان ان میں تبلیغ اسلام کریں تو وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں ۔

(۵) امریکہ کا سب سے بڑا شہر نیو یارک ہے لیکن وہ امریکہ کا پایۂ تخت نہیں ہے ۔ امریکہ کا پایۂ تخت صرف ایک حصہ امریکہ کے اعتبار سے واشنگٹن ہے ۔ نیو یارک امریکہ ہی کا نہیں دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اگرچہ انگریز اس کو نہیں مانتے اور لندن کو دنیا کا سب سے بڑا شہر کہتے ہیں ۔

(۵) امریکہ کی ترقی مغرب یعنی یورپ کی ترقی سے صد چند آگے ہے ، حالانکہ وہ مدت کے اعتبار سے صرف دو سو برس کی نئی نویلی ترقی ہے ۔ لیکن امریکہ کی ترقی اصل میں مغرب ہی کی ترقی ہے کیونکہ امریکہ میں کون ہیں ترقی کرنے والے، مغربی ہی لوگ تو وہ مغربی لوگ جو مغرب سے نکل کر امریکہ میں نو آبادیاں بسانے اور کمانے چلے گئے تھے ۔ پھر بھی امریکہ کی ترقی کو امریکنوں کی ترقی ہی کہا جائے گا ، جب یہ سوچا جائے کہ اگرچہ وہ گئے تھے مغرب ہی سے مگر بس تو گئے امریکہ میں ۔

(٦) بہرحال امریکہ کی ترقی کل دو سو برس کی ہے ، پھر بھی مغرب کی ترقی سے وہ صد چند آگے ہے اور مشرق کے مقابلے میں کتنی آگے ہے اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا ۔ مگر امریکہ کی ترقی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو سمجھانا ہی ہے ۔

(۷) امریکہ کے آباد کار مغربیوں کو جو علم و عمل کی صلاحیتوں کا لشکر لیے ہوئے امریکہ میں پہنچے تھے وہ اچھوتی لمبی چوڑی بہشتیں مل گئیں جو ہر آباد کو دولت اور نعمت کے بے حساب ذخیرے اگل سکتی تھیں اور اگلا ۔ یہ بات مغربیوں کو مغرب میں خواب کے سوا اصلیت میں کہاں میسر آسکتی ہے ؟

(۸) امریکی ترقی کی تیزی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی، جب امریکہ نے اپنے کو انگلستان سے جدا کر لیا یعنی اپنے گلے سے سیاسی محکومی کا طوق اتار کر پھینک دیا اور پہلی بار چلائے: 'ہم امریکینوں لا بریطانیون، ہم امریکی ہیں برطالوی یعنی انگریز نہیں ہیں، یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ترقی کا سارا بھید انانیت میں ہی چھپا ہوا ہے بشرطیکہ انانیت کو علم اور محنت کی سرپرستی میں عملاً بھی ٹھیک برتا جا سکے، ورنہ انانیت تباہ کن ٹھہر سکتی ہے۔ لیکن اگر انانیت ہی نہیں ہے تو پھر ترقی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(۹) امریکہ کی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عرصے تک سیاست کی الجھنوں سے الگ تھلگ رہتی ہوئی چلی ہے۔ اس لیے تیز بھی چلی ہے اور بے زخم بھی چلی ہے۔ امریکہ کو یہ روش اختیار کرنے میں آسانی تھی۔ وہ پرانی دلیا سے الگ تھلگ بھی تھا کیونکہ اس کو مغرب اور مشرق دونوں کے دو بڑے سمندر الگ کیے ہوئے تھے۔

(۱۰) امریکہ دو سو برس کے بعد پہلی بار دوسری جنگ عظیم میں کھل کر سیاست میں داخل ہوا ہے۔ وہ بھی انگلستان کی پردرد التجاؤں پر داخل ہوا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے دخل نے انگلستان کو بچا لیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ امریکہ خود پھنس گیا اور ایسا پھنس گیا کہ اس کا چھوٹنا اب محال نظر آتا ہے۔ واہ رے انگریز واقعی تیری سیاسی چالبازیوں

اور شاطریوں کا اب تک کوئی جواب نہیں، جیسا کہ امریکہ
کی کاروباری صلاحیتوں اور قابلیتوں کا کوئی جواب نہیں ۔

(۱۱) امریکی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے
سلطانی اور شاہی کو بھی گوارا کرنے کی پیچیدگی کو برداشت
نہیں کیا ۔ امریکہ کا دماغ سبحان اللہ کتنا صاف تھا ۔

(۱۲) امریکی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے
یہودیوں کو پوری پناہ دے دی جس کو نہ مغرب دے سکا
تھا نہ مشرق ۔ پھر یہ بھی ہے کہ امریکہ نے اس فراخدلی
کا صلہ بھی بہت قیمتی پایا ۔ وہ یہ کہ یہودیوں نے اپنے غیر
معمولی تعمیری دماغ کو جی لگا کر جو خرچ کیا تو
امریکہ ، امریکہ بن گیا ۔ یہودی نہ ہوتے تو یہ بھی ممکن
تھا کہ امریکہ اپنے تمام سامانوں اور صلاحیتوں کے باوجود
بجائے امریکہ کے افریقہ بن جاتا ۔

(۱۳) امریکی ترقی کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس نے
سوالالوں اور کالوں کے کسی پر ظلم نہیں کیا ۔ لالوں سے
میری مراد امریکہ کے اصلی باشندے اور کالوں سے مراد
امریکہ کے وہ افریقی لوگ ہیں جن کے داداؤں نے امریکہ
کو اپنی محنتوں سے آباد کیا تھا ۔

(۱۴) امریکی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنا
نظام وحدانی بسیطی نہیں رکھا بلکہ اجتماعی ترکیبی بنایا ۔

(۱۵) امریکہ کی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے پوری دنیا کو آسمان ترقی پر پہنچا دینے کا عملی ارادہ کر لیا ہے اور عملی کام شروع کر دیا ہے ۔ اور اسی کی اس مربیانہ فیاضانہ خدمت عامہ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ بھوکا حجاز بھی روٹی کی شکل دیکھنے لگا ہے ورنہ وہ یقیناً ہلاکت کے غار تک پہنچ چکا تھا ۔

(۱۶) امریکی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے غلاموں کی مدد پر ہمیشہ نظر رکھی ۔ اس کی پوری تاریخ اس کارخیر سے بھری پڑی ہے ۔

(۱۷) امریکی ترقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مزدوروں کو رئیس بنا دینے کی کوشش کی ۔ اس نے ہر گھر کو موٹر رکھنے کی طاقت دینے کے لیے دونوں طرف سے کام کیا ۔ ایک موٹر کی قیمت کی طرف سے یعنی اس کو اتنا گھٹا دیا کہ متوسط الحال مزدور تو خریدنے کے لائق ہو ہی چکا دوسرے مزدور کی مزدوری کی طرف سے ، یعنی اس کو اتنا بڑھایا کہ مزدور عموماً خوش حال ہوگیا ۔ ہر تین گھر میں ایک موٹر کار کا اوسط تو اس وقت بھی حاصل ہو چکا ہے ۔

(سفر نامۂ ربانی ، ص ۱۳۵ - ۱۷۲)

آزاد سبحانی بحیثیت ادیب و شاعر

مولانا آزاد سبحانی کا تخلص آزاد تھا اور اردو میں شعر کہتے تھے ۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں "حلقہ ادبیہ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد اردو شعر و ادب کی خدمت تھا ۔ ان کے فیض یافتہ لوگوں میں "گلابی اردو" والے ملا رموزی اور معروف شاعر ثاقب کانپوری زیادہ نمایاں ہیں ۔ مولانا آزاد کی ایک غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے جس سے ان کے شعری ذوق کا اندازہ ہو سکتا ہے :

نقطۂ اوج نام پر ، ماہ تمام آ گیا
یعنی وہ چاند حسن کا بر سر عام آ گیا

شکر ہے زیر احتساب ، آ گیا نام شیخ بھی
مشرب اہل جام میں ، منکر جام آ گیا

پرسش لطف ظاہری حائل مدعا ہوئی
دام فریب یار میں عاشق خام آ گیا

لائق امتحان نہ تھا میں کہ تھا بے دل و جگر
جذبہ شوق امتحاں وقت پہ کام آ گیا

موقع امتحاں سے قبل دعویٰ امتحاں غلط
کانپ اٹھا ہوں جب کبھی جور کا نام آ گیا

حاصل و سعی راہ عشق، آج ہے نقد جیب دل
جان حزیں کی مانگ ہے، چلیے پیام آ گیا

کس کو تھی تاب میکشی، ہوئے دو بند میکدے
نیّت اتقا کرو، ماہ صیام آ گیا'

خواجہ جمیل احمد صاحب لکھتے ہیں :

"روشن باغ الہ آباد میں شہر کے مشہور وکیل مولوی غلام مجتبٰی جعفری صاحب مچھلی شہری کی عالی شان کوٹھی کا باہری کمرہ طلباء کے لیے وقف تھا۔ مولوی صاحب بڑے کنبہ پرور انسان تھے۔ اس میں قیام کرنے والوں میں ڈاکٹر پیر شاہ محمد سلیمان، کرنل عون جعفری وغیرہ بھی تھے۔ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ مولوی غلام مجتبٰی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی ابوالحسن جعفری ایڈوکیٹ ان کے تنہا وارث تھے۔ اگست کا مہینہ اتوار کا دن تھا' اس کمرے میں ہادی مچھلی شہری، اصغر گونڈوی، مولانا آزاد سبحانی، ریاض الحسن صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے) اور ابوالحسن جعفری صاحب مصروف گفتگو تھے۔ جہاں چند شعرا جمع ہو جائیں وہاں شعر و شاعری کی محفل گرم ہونا یقینی ہوتی ہے۔ ہادی مچھلی شہری نے سب سے پہلے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد اصغر صاحب کی باری آئی۔

بعد ازاں حاضرین نے مولانا آزاد سبحانی سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنے کلام سے محفل کو محظوظ کریں ۔ پہلے تو مولانا انکار کرتے رہے ۔ کہنے لگے سیاست نے مجھے شعر و شاعری سے بے بہرہ کر دیا ہے ۔ لیکن جب اصرار بڑھا تو راضی ہو گئے اور انھوں نے ایک بڑی جاندار غزل سنائی ۔ ان کا عارفانہ کلام سن کر اصغر صاحب بھی پھڑک اٹھے"۔

اس کے چند اشعار یہ ہیں :

خاک پا بن کے در یار پہ جانا ہے مجھے
اپنی مٹی کو ٹھکانے سے لگانا ہے مجھے

پا برہنہ ہوں ، سفر وادی ایمن در پیش
اک چراغ اور سر طور جلانا ہے مجھے

دشت میں آیا ہوں صحرا کے بگولے دوڑو
دوسرا مصرعہ یاد نہیں آتا

مولانا کا کلام بہت شستہ ہوتا تھا ۔ عارفانہ رنگ غالب تھا [۲] ۔

حواشی

۱ ۔ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) ۔ مئی ۱۹۱۹ء ، ص ۶۲ ،
۲ ۔ چند یادیں : ص ۱۱۵ ۔ ۱۱۶

اشعار

میں اپنے درد کی تفسیر کر نہیں سکتا
میں اپنے خواب کی تعبیر کر نہیں سکتا

میں جانتا ہوں کہ تقدیر ہے اٹل اے دل
مگر میں رخصت تدبیر کر نہیں سکتا

وہ داد کے طالب تھے میں یاد کا طالب تھا
لیکن دل فریادی فریاد کا طالب تھا

دل کا دماغ عرش سے بھی کچھ بلند تھا
پھر بھی یہ کہے دوں کہ بہت ارجمند تھا

ایک میری مستمندی پہ کیوں طعن اے فلک
دیکھا تو تُو بھی ایک کمیں مستمند تھا

لیکن میرے خیال سے آگے نہ جا سکا
ہر چند رخش وقت رواں سا سمند تھا

واعظ کسی کو لا نہ سکا اپنی راہ پر
بیچارہ بے دماغ فقط مرد پند تھا

سبحانی تھا خیال میں بالا و ارجمند
گو نقطۂ حصول سے نا ارجمند تھا

وائے اس وقت سحر پر جس میں میں خوابیدہ تھا
برکت انفاس سے میری جو تو بالیدہ تھا

بہت حسین ملے پر کوئی جواب نہ تھا
ستارے لاکھوں مگر کوئی آفتاب نہ تھا

بہت خراب ملے اس خراب خانے میں
ترے خراب کا سا ایک بھی خراب نہ تھا

بہت خطیب سنے نغمہ ساز خطبہ سرا
کسی خطیب کے منہ میں تیرا خطاب نہ تھا

نہ پوچھ قصہ الفت کہ اک قیامت ہے
نہ مجھ پہ گذرا ہو ایسا کوئی عذاب نہ تھا

بہت حسین تھے مگر ایک بھی جواب نہ تھا
تمہارا حسن حقیقت تھا کوئی خواب نہ تھا

وہ سوز تھا جگر کا کہ سینہ بھی جل اٹھا
وہ آگ دل کی تھی کہ مدینہ بھی جل اٹھا

قالب کا سوز پھونک گیا مغز روح کو
خاتم کی آگ وہ تھی نگینہ بھی جل اٹھا

بھڑکی وہ آگ قلب میں تنّور عشق سے
سینے کے ساتھ سینے کا کینہ بھی جل اٹھا

آنسو نہیں ہیں آگ کے ٹکڑے ہیں اے جگر
کیا تو ہے یوں جلا کہ پسینہ بھی جل اٹھا

اس پر برہم نہیں کیوں کوئی سہارا ڈھونڈا
ان کے چھٹ جانے پہ کیوں دوسرا پیارا ڈھونڈا

بھلا کے بھی انھیں اے دل کبھی بھلا نہ سکا
چراغ عقل کو گھر میں کبھی جلا نہ سکا

میں ڈھونڈتا ہی پھرا رہ گیا تسلی کو
کہاں پہ جا کے چھپی ہے کہ اس کو پا نہ سکا

نہ پوچھ حالت مجبوری نزاکت کو
انھیں بلا نہ سکا اور خود میں جا نہ سکا

وہ بیچ بیچ تھے دو مختلف مزاجوں کے
کہ جذب عشق بھی یگانوں کو ملا نہ سکا

غضب تھا لوتھی فہم مہربان کا ظلم
حقیقت دل مظلوم کو جتا نہ سکا

نہاں تھے زخم جگر ہائے اتنے پردوں میں
بہت دکھانے کی کوشش کی پر دکھا نہ سکا

فکر بربادی میں بھی تیز قدم ہے ان کا
پر نگہداشت پہ بھی صاف کرم ہے ان کا

شہرت ہے کوئی جلوۂ مستانہ کرے گا
اور رفعت سے عشق کا پیمانہ کرے گا

ہنگامہ سے نکلے گا کوئی شاہد پردہ
ہر دیکھنے والے کو جو دیوانہ کرے گا

پھر آتش دل زور پہ ہوگی مثل طور
پھر رقص کوئی شعلۂ مستانہ کرے گا

سنتے ہیں کوئی رند اٹھے گا درِ مے سے
. . . .[۱]

---

۱ ۔ دوسرا مصرع اصل میں نہیں ہے ۔

اک مست محبت نے دیوانہ بنا ڈالا
اک جام محبت سے مستانہ بنا ڈالا

وہ بھی تھا وقت کہ بازو کسی بازو میں رہا
اب وہ ہے وقت مرا دل بھی نہ پہلو میں رہا

دل اب اس حال میں ہے خاک کف پا بھی نہیں
یا یہ تھا حال کہ سر ہر خم گیسو میں رہا

اب پکاروں بھی تو سنتا نہیں کوئی آواز
یا اشارہ مرا تھا چشم سخن گو میں رہا

اب میسر نہیں گرد کف پا بھی سونگھوں
یا کہ ڈوبا لب گلگوں ہی کی خوشبو میں رہا

اب تو ہوں سارے زمانے کا میں ہی بیگانہ
یا وہ تھا میں کہ نہ کچھ فرق من و تو میں رہا

وقت خوش لوٹے گا پھر رنج نہ کر سبحانی
پھر ترے قابو میں آئے گا جو قابو میں رہا

میں جاہل آئین محبت تھا ستم گر
تو ہی نے مجھے عارف آئین بنایا

پندار کا بت تجھ سے بھی تھا سخت مرے بت
. . . . [1]

اس نے کبھی جو بو بھی ہو سونگھی شراب کی
پھر کس نشے نے زلف کو مستانہ کر دیا

اتنا مٹایا نقش دوئی کو جمال نے
خود کو غم خودی سے بھی بیگانہ کر دیا

ان کے امید واروں میں میرا بھی نام ہے
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

اک آہ ایسی کھینچی کہ ارمان جل گیا
گھر میں تھا جو بھی تھوڑا سا سامان جل گیا

وہ آئے یوں جلے ہوئے محفل میں ہائے ہائے
اک آنچ پا کے جن کی ایمان جل گیا

محفل میں اک نگاہ سے بھی بخل کر گئے
اے آسمان کیا ترا فیضان جل گیا

وہ ظلم کر رہے ہیں ترا عدل روند کر
یا رب یہ کیا ہوا ترا فرمان جل گیا

---

۱ - دوسرا مصرع اصل مسودہ میں نہیں ہے -

میں نے دیا تھا دل انھیں ان کی ہی چاہ پر
پھر کیا ہوا کہ خانۂ احسان جل گیا

وہ اس طرح سے چپ ہیں کہ گویا نہیں ہیں وہ
کیا عالم کلام کا امکان جل گیا

وہ پھیرے رخ کو بیٹھے ہیں گویا نہیں ہوں میں
کیا اس جہاں کا نقشہ عرفان جل گیا

مجھ کو جلانے کے لیے محفل میں آئے تھے
خوش ہوں کہ ایک دشمن انسان جل گیا

سبحانی سرد مہری کی وہ آگ ہے لگی
سینے میں میرے شعر کا دیوان جل گیا

درد دل کا نہ گیا زخم جگر کا نہ گیا
اثر ضرب نہاں تیر نظر کا نہ گیا

مست ہوں دیکھ کے گو جلد وہ اٹھ بیٹھے مگر
ان کی آنکھوں سے اثر خواب سحر کا نہ گیا

ہم نے چاہا تھا کہ اپنے ہی میں گم ہو جائیں
پر تصور تیرے بازو و کمر کا نہ گیا

جتنے ہتھکنڈے تھے حکمت کے وہ سب کر دیکھے
پر اثر دیدہ جادوئے نظر کا نہ گیا

دل دیا دین دیا جان دی سر دے ڈالا
کس قدر تیز تھا سودا میرے سر کا نہ گیا

ہزار عیش پہ بھی ہائے ایک غم نہ گیا
وہ درد سینے میں بیٹھا جو ایک دم نہ گیا

ان کو بھی میں نے راہ پہ دل کی لگا لیا
آغوش عشق میں انھیں دل نے بٹھا لیا

ان کو خبر بھی ہو نہ سکی اور آتر گئے
. . . .[۱]

ادھر کی تڑپ ہے ادھر کی تڑپ
سبب کی تڑپ ہے اثر کی تڑپ

برباد میں ہوا تو دل ناتواں کے ہاتھ
مارا گیا میں اپنے ہی اک مہرباں کے ہاتھ

---

۱ - اصل مسودہ میں دوسرا مصرع نہیں ہے۔

سینہ پھٹ جانے کو ہے زور الم کے باعث
ہستی خطرے میں ہے انبوہ ستم کے باعث

کیا وہ بھی ہیں مبتلا میری طرح
بندہ ہیں اے خدا میری طرح

لکھوں گا ان کو عفو کی تحریر جائے عذر
میں خوب پا چکا دل ناداں سزائے عذر

میں جا رہا ہوں جھیلنے اقرار جرم کو
میں جا رہا ہوں مانگنے عفو خطائے عذر

میں جانتا ہوں رنگ طبیعت کو ان کے دل
بہتر ہے ان کے واں طلب عفو جائے عذر

ہر فلسفی سے زیادہ ہیں وہ فلسفی نظر
ہر عذر رد ہے اتنے ہیں نبض آشنائے عذر

سبحانی آپ پر ہوئی اب راہ راست وا
ان کی جناب عفو کی جا ہے نہ جائے عذر

رہا نہ بس میں علاج دل جنوں پرور
گزر گیا ہے حد اضطرار سے مضطر

جگر کا حال نہیں دل سے کچھ سوا بہتر
جگر ہے کاہے کو رقاص پارۂ اخگر

دماغ قلب و جگر دونوں سے گیا گذرا
یہ جانئے سیل رواں اک جما ہوا پتھر

ہوا ہے ذہن وہ بےکار گویا مردہ ہے
شعور و عقل کی حالت جنوں سے بھی بدتر

نہ پوچھ حالت ایمان و دین یہ این عالم
ٹھکانے ہوش کسی کا نہیں ہے وہ چکر

میں اپنے آپ میں سبحانی ہوں کہاں باقی
فلک پہ بھی وہ نہ گزری جو گزری ہے مجھ پر

ان کی سختی میں کوئی رقت پنہاں ہے ضرور
مجھکو گریہ ہےتو دل ان کا بھی گریاں ہے ضرور

تمھیں نکالنا تھا اختیار سے باہر
تمھیں سنبھالنا تھا اقتدار سے باہر

میں آشنائے راز ہوں وہ آشنائے راز
پھر غیر درمیاں میں ہے کیوں در قفائے راز

وہ جانتے ہیں مجھ کو انھیں میں ہوں جانتا
کیوں سر کھپاتے پھرتے ہیں نا آشنائے راز

سہتا رہوں خموش جفا کو تمام عمر
مجھ کو ملا ہے آہ یہ حکم وفائے راز

مرد طلب کہاں ہے جو ہو عاشق فنا
ہے موت سرمدی میں عیاں یہ صلائے راز

فکر خودی نہ فکر خدا صرف بے خودی
اللہ کرے کسی کو نہ یوں مبتلائے راز

سبحانی جھگڑے راز کی چھوڑو بھی فکر خام
نے ابتدائے راز ہے نے انتہائے راز

صیاد کو ملال تھا ویراں ہوا قفس
طائر پھر آ گیا تو گلستاں ہوا قفس

وہ جانتے نہیں ہیں کہاں تک ہے تاب ضبط
وہ بے خبر ہیں از ستم التہاب ضبط

اس وادی نے بھی آب تسلّی نہیں دیا
آیا نہ اپنے کام کسی دن سراب ضبط

اب شام اضطراب ہے سر پر گھری ہوئی
ڈھلنے پر آ گیا ہے دل آفتاب ضبط

وہ اور غم ندیم ہے غم کی خبر غلط
جیسے کہ ہو ستم کے کرم کی خبر غلط

میں چکھ رہا ہوں اب اپنی زبان درازی کا پھل
میں پا رہا ہوں اب ان کی گدا نوازی کا پھل

ہے ان کی یاد میں کوئی اب تلک اثر اے دل
ہے ان کے قطع تعلق کی کیوں خبر اے دل

نظر پڑی ہو کسی پر ترے سوا تو قسم
کیا ہو رخ بھی کبھی سمت دوسرا تو قسم

اُترنا دل میں کسی اور دلربا کا تو خیر
جچا ہو آنکھ میں بھی کوئی دلربا تو قسم

تری شکایت نا مہربانی پیش بشر
ہے گلہ کبھی بولا ہوں یا خدا تو قسم

ہزار گالیاں سن کر بھی تیری غیروں سے
اگر زباں نے ہو اُف بھی کبھی کیا تو قسم

ہے سلامتِ کشتیِ زندگی جز تو
خدا کو بھی جو بنایا ہو نا خدا تو قسم

وہ ماجرا جو تیرے جود سے گزرتا ہے
فرشتے نے بھی اگر ہو کبھی سنا تو قسم

وفائے الفت سبحانی ہائے مت پوچھو
کبھی ہوا ہو خودی میں بھی مبتلا تو قسم

مخالفت میں بھی رنگ موافقت ہے عیاں
منافرت میں بھی شان مطابقت ہے عیاں

یہ بھی خواہش ہے کہ پامال ستم ہو جاؤں
یہی کاوش ہے نہ راہی عدم ہو جاؤں

یہ بھی ہے فکر کہ سر سے یہ بلا ٹل جائے
اس کی تدبیر بھی ہے خاک قدم ہو جاؤں

یہ بھی کوشش ہے کہ سر رشتہ دیں چھٹ جائے
یہ بھی ہے فکر پرستار صنم ہو جاؤں

نہ رہی اتنی بھی اب تاب زباں کو کھولوں
اس کا اندیشہ کہاں باب بیاں کو کھولوں

میں ان کے قطع تعلق کو سچ اگر مانوں
پھر ان کی یاد کو کس وجہ پر اثر مانوں

جب ان کی یاد کبھی کی ہے رو کے اٹھا ہوں
غبار دل کو میں آنکھوں سے دھو کے اٹھا ہوں

ان کی تصویر سے اب دل کو میں بہلاتا ہوں
اک کھلونے سے اک طفل کو میں بہلاتا ہوں

الزام ہے مجھ پر کہ میں چالاک بہت ہوں
یعنی کہ تمناؤں میں بے باک بہت ہوں

اے کاش جانتا میں کہ کتنا رسیدہ ہوں
ہوتا نہ وہ جو ہے کہ فقط نا رسیدہ ہوں

ان کی عنایتوں نے تھا گستاخ کر دیا
اس کا یہ پھل ہے اب میں گل خاک دیدہ ہوں

وہ مجھ سے خفا ہیں کہ انھیں جرم لیا کیوں
میں ان سے ہوں فریادی کہ الزام دیا کیوں

سچتے تھے اپنے وعدے کے آئے وہ خواب میں
پیغام شکر بھیجیے ان کی جناب میں

بے پردہ جلوہ گر تھے نگاہوں کے سامنے
میں ہی نہ ان کو دیکھ سکا اضطراب میں

مزے کی زیست کا چہرہ چھپا رہا ہوں میں
غذائے غم کو دل زار کھا رہا ہوں میں

صدائے خستہ کو سن کر نکل پڑیں شاید
بس اس لیے پس دیوار گا رہا ہوں میں

مرے وجود کو تا ذہن ان کا بھول نہ جائے
صدا انھیں کسی حیلے سنا رہا ہوں میں

حواس چھوڑ نہ دینا کہیں ہم ساتھ مرا
جوار کوچۂ جاناں میں جا رہا ہوں میں

واقف ہوں رمز عشوہ سے جاہل نہیں ہوں میں
مانا کہ تجھ سا زیرک و عاقل نہیں ہوں میں

گو ہوں غریق بحر ستم ہائے روز و شب
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں ہوں میں

بیدادیں ساری مانا ہیں صرف آزمائشیں
یہ بھی تو جان جوہر حامل نہیں ہوں میں

کیسے سہوں تلاطم امواج کو ترے
دریا ہے تو یہ سینۂ ساحل نہیں ہوں میں

اتنا ہی ڈال بار تغافل جو اٹھ سکے
انساں ہوں خشتِ کالبدِ گل نہیں ہوں میں

کیسے نہ مضطرب ہوں حوادث جو آ پڑیں
ہوں اہل دل سے، جامد و بے دل نہیں ہوں میں

مانگوں گا لاکھ بار تجھی سے مگر یہ شرم
کھو بیٹھوں آبرو کو وہ سائل نہیں ہوں میں

ہر ظلم سہہ سکوں گا یہ امید التفات
بے وجہ کچھ بھی ہنسنے کے قابل نہیں ہوں میں

غم نے بتا دیا ہے کوئی اور بھی حیات
سبحانی اس حیات کا حاصل نہیں ہوں میں

مجھ کو شکست ہو گئی منصور آپ ہیں
پر یہ تو کہیے دل میں بھی مسرور آپ ہیں

اک دن جھکا کے چھوڑے گی یہ خاک عاجزی
مانا کہ آسماں کے سے مغرور آپ ہیں

کیوں آنسو اُبلتے آتے ہیں کیوں آنکھیں نم ہوتی جاتی ہیں
کیوں تڑپیں بڑھتی جاتی ہیں کیوں شادیاں غم ہوتی جاتی ہیں

مرے لحاظ سے وہ بھی بدلتے جاتے ہیں
مثال سنگ تھے لیکن پگھلتے جاتے ہیں

وہ آ کے خواب تلک میں ستائے جاتے ہیں
خیال پر بھی حکومت جتائے جاتے ہیں

نہیں وہ راضی کہ سو جاؤں خواب غفلت میں
وہ خواب میں بھی پہنچ کر جگائے جاتے ہیں

وہ بن کے گلہ تند تغافل مرے گھر ہیں
اے صبر دل زار، یہ سب تیرے ثمر ہیں

ظاہر میں وہ جامد ہیں یہ باطن میں رواں ہیں
سختی میں عیاں ہیں یہ لطافت میں نہاں ہیں

کچھ معنی ہی واقف ہے کہ کیا ان کی ہے منزل
کیا رسم بتائے وہ حقیقت میں کہاں ہیں

تدبیر کوئی ان کے لیے کارگر نہیں
چارہ کوئی چلانے کو اے چارہ گر نہیں

کیوں ان پہ بس کسی کا نہیں چلتا اے خدا
کیا ان کی نوع جنس ز جنس بشر نہیں

کیا تجھ کو اے زمانہ سناؤں میں داستاں
میری کہانی تیری طرح مختصر نہیں

میں ان کی ہاں کو نہیں سمجھا ہاں کو نہیں
میں ان کے دل ہی کو دیکھا کیا زباں کو نہیں

زمیں پہ چل کے انھوں نے اٹھائے ہیں فتنے
زمیں کو دوں گا میں الزام آسماں کو نہیں

شکایت اس کی ہو جو مہرباں رہا ہو کبھی
میرا گلہ کبھی اس غیر مہرباں کو نہیں

چراغ پا نہ ہو اے پاسباں بندۂ وہم
ہم آسماں کو چومیں گے آستاں کو نہیں

قصور دل کا نہیں ہے فقط زباں کا ہے
زباں کو کاٹنے کا شوق بے زباں تو نہیں

مری نگاہ میں ہے اک مہ جبین پر افشاں
جبیں کو ڈھونڈتا ہوں چرخ و کہکشاں کو نہیں

قصور وار نہیں ہے زبان تو اے دل
میں راز دار کو پکڑوں گا راز داں کو نہیں

مری کہانی مرے منہ سے سن کے فرمایا
تری زباں کو سراہوں گا داستاں کو نہیں

نظر میں جلوۂ پیشین ہے نقشِ سبحانی
میں حال کو تو بھلا دوں گا پاستاں کو نہیں

ان کی خطائیں میری خطائیں
ان کی جفائیں میری جفائیں

میری صفاتیں ان کی صفاتیں
میری وفائیں ان کی وفائیں

وہ نہیں مجرم میں ہوں مجرم
وہ نہیں میں ہوں لائق سزا کا

وہ ہیں بری ہر حکم سزا سے
ان کی سزائیں میری سزائیں

شان ان کی شان محبوبی
درجہ مرا درجہ محبی

ان کی لیے معصومی مطلق
میرے لیے دنیا کی خطائیں

صبر و تحمل فرض تھا میرا
مجھ کو گلہ مطلق نہ تھا زیبا

کر کے گلہ میں بھول گیا تھا
ان کی خطائیں میری خطائیں

تمھیں سبحانی جھیلنی ہوں گی
ساری سزائیں بے دم مارے

تم کو اٹھانی ہوں گی بلائیں
سمجھ کے ان کو ان کی ادائیں

تجھ کو بھی خدا رحم دے گر صبر دے مجھ کو
کچھ تجھ کو بھی دے اجر اگر اجر دے مجھ کو

وہ آ کے خواب میں سب کچھ سنا گئے مجھ کو
جو راز پردہ تھا وہ تک بتا گئے مجھ کو

ہاں آتش دل پھونکنے اٹھی ہے جگر کو
کروبیو پہنچاؤ سر عرش خبر کو

اے مرد طرب روتا ہے تو بھی مرے مانند
تو رات کو روتا ہے میں روتا ہوں سحر کو

یہ معجزہ مرے دل نے دکھا دیا ان کو
وہ دکھ یہ ہنستے تھے پھر دکھا دیا ان کو

تری تڑپ کی ترقی دلیل ہے اے دل
کہ تیرے حال نے تجھ سا بنا دیا ان کو

رات اپنی تڑپ دیکھ کے میں پا گیا ان کو
میرا غم دل کہا کے مجھے کھا گیا ان کو

ہر سعی تعلق تو ملی خاک میں لیکن
انداز تغافل مرا کچھ بھا گیا ان کو

کاش دیتا نہ میں تشریح مکرّر ان کو
یوں بناتی نہ مری بات مکدّر ان کو

ان کی تصویر ہی اب ان کی جگہ آ بیٹھی
ان کی تصویر انھیں میرے لیے لا بیٹھی

ان کی تصویر تھی ان سے کہیں بہتر دل کش
کھینچ کر ان کو تہہ دل سے وہ خود جا بیٹھی

بڑھتا ہی گیا درد جگر جتنی دوا کی
اے مرشد دل اب تو ضرورت ہے دعا کی

اللہ سلامت رکھے ارمان ستم کو
حاجت نہ رہی حشر کو بھی فکر جزا کی

جب قطع تعلق ہے تو کیوں یاد کسی کی
کیا آنکھوں میں ہے صورت ناشاد کسی کی

کوئی تو ہے فریاد میں ڈوبا ہوا اے شب
کانوں میں چلی آتی ہے فریاد کسی کی

بیداد سے بے زاری کی خو کیوں ہے نمایاں
ملتی ہے گلے رحم سے کیا داد کسی کی

ہے چرخ بھی چکر میں کہ کس طرح سنبھالے
برہم ہے وہ طبع ستم ایجاد کسی کی

کیا غم نے مرے ڈال دیا ان پہ بھی سایہ
کیوں خم نہیں اب ابروئے بیداد کسی کی

شادی کے سب اسباب تھے جب جمع مرے دل
کیوں زندگی یوں ہوگئی ناشاد کسی کی

ہر صورت آباد بنی صورت برباد
دیکھی نہیں یوں زندگی برباد کسی کی

اللہ ترا شکر کہ اب وہ بھی ہیں غمگین
پابند ہوئی فطرت آزاد کسی کی

دوبھر ہوا جینا بھی تو مارے ستموں کے
سبحانی تمھیں چاہیے امداد کسی کی

کسی کی یاد مجھے آج تک رلا نہ سکی
اک ان کی یاد تھی رونے کو جو ہٹا نہ سکی

الٰہی راز ہے کیا اصلیت نہیں کھلتی
وہ دوست ہیں کہ عدو، نوعیت نہیں کھلتی

ہے اتنے پیچ میں ان کی ادائے پیچیدہ
ستم وہ ہے کہ کرم، کیفیت نہیں کھلتی

وجود پر بھی ہے دھوکا عدم کی صورت کا
وجود ہے کہ عدم ، اصلیت نہیں کھلتی

ہمیشہ تم رہے تاریکی ہی میں سبحانی
یہ پردہ اٹھتا نہیں معرفت نہیں کھلتی

دل فکار میں جائے رفو نہیں ملتی
گھٹتا ہے وہ کہ امید نمو نہیں ملتی

جھلک تو ملتی ہے چھن چھن کے جو نکلتی ہے
مگر تجلّی رخ روبرو نہیں ملتی

ہزاروں جلوۂ در پردہ دیکھ ڈالے ہیں
مگر تجلّی بے پردہ تو نہیں ملتی

کہاں نہفتہ ہے او عندلیب خسرو گل
کسی روش میں کہیں کوئی بو نہیں ملتی

. . . .[۱]
نماز کیسے ہو جائے وضو نہیں ملتی

---

۱ ۔ پہلا مصرع اصل مسودہ میں نہیں ہے ۔

کہیں تمھیں نظر آئے تو کہنا سبحانی
مجھے کہیں بھی تری جستجو نہیں ملتی

چاہا بہت نکال دوں ان کو خیال سے
ثابت ہوا کہ لڑ میں رہا ہوں محال سے

پھر سر مرے سوار ہے پہلا وبال دل
سمجھا تھا میں کہ چھوٹ گیا اس وبال سے

دعویٰ تمھیں ہے واقف اسرار حال ہو
بےچارہ دل بھی جہل میں ہے میرے حال سے

کیوں غم سنائے کوئی کسی انتقال پر
دنیا بدل نہ جائے گی اس انتقال سے

چراغ دیں کو جلایا ہے روغن دل سے
ستارے میں ہے جلا عکس جلوۂ گل سے

نجات ہے نہ غم دھر سے نہ ماتم سے
لگی ہوئی ہے قیامت میرے دل و دم سے

مرے سکون سے عالم کو مل سکے گا سکوں
تمام خلق رمیدہ ہے اک مرے دم سے

کوچۂ جاناں میں جانا بند ہے
یعنی جینے کا ٹھکانا بند ہے

اب تعلق دشمنی کا بھی نہیں
گاہے گاہے بھی ستانا بند ہے

امتحاں کا بھی سہارا چل بسا
مدتوں سے آزمانا بند ہے

نہ قرار ہے نہ سکون ہے نہ سکون ہے نہ قرار ہے
نہ قرار ہے نہ قیام ہے نہ قیام ہے نہ قرار ہے

دل زار اتنا فگار ہے کہ نہیں ہے جائے رفو کہیں
. . . .[۱]

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے جب یاد کسی کی آتی ہے
اک درد جگر میں پلتا ہے جب یاد کسی کی ستاتی ہے

اب بھی کیوں ہمدمو یاد ان کی چلی جاتی ہے
ان سے رنج پا کے بھی کیوں روح چلی جاتی ہے

ان کی دھتکار سے مایوس نہیں کیوں ہوتی
آرزو کیوں پھر اسی سمت بڑھی جاتی ہے

---

۱ - دوسرا مصرع اصل مسودہ میں نہیں ہے -

یاد کیوں ان کی مجھے آ کے رلا جاتی ہے
کیا کوئی حالت غم آ کے سنا جاتی ہے

گھلا کے جاتی ہے ظالم بھلا کے جاتی ہے
تمھاری یاد ہمیشہ رلا کے جاتی ہے

انھوں نے مکر سے بہکا دیا مجھے ہے ہے
انھوں نے باتوں میں بہلا دیا مجھے ہے ہے

اشاریہ

اشخاص

آ

آربندو : ۲۱۳
آزاد، ابوالکلام مولانا: ۱۰، ۱۸، ۴۹، ۵۱
آزاد، سبحانی مولانا (نیز ملاحظہ ہو: الفیلسوف الہندی، عبدالقادر، مولانا آزاد سبحانی) ۱ - ۵، ۶ - ۱۳، ۱۷ - ۲۱، ۲۴ - ۲۹، ۳۰ - ۳۳، ۳۴ - ۴۰، ۴۱ - ۴۳، ۴۷، ۴۹ - ۵۲، ۵۳ - ۵۶، ۵۷ - ۶۲، ۹۷، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۲۲۷ - ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۲
آسی عبدالعلیم (سکندر پوری) : ۱
آسی، غازی پوری : ۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم : ۸۶

الف

ابراہیم سیالکوٹی : ۲۸
ابراہیم سیالکوٹی، مولانا : ۹۴
ابراہیم لنکن : ۲۲۱
ابلیس : ۱۸۸
ابن تیمیہ، امام : ۶۰
ابوالحسن جعفری، مولوی : ۲۷۸
ابوالقاسم بردوانی : ۱۰۸
ابوالکلام آزاد، مولانا (نیز ملاحظہ ہو آزاد) : ۳۳، ۴۰، ۸۸، ۸۹، ۹۲ - ۹۴، ۹۵، ۹۶
ابوالہاشم : ۳۴، ۴۲، ۵۲
ابو حنیفہؒ، امام : ۱۸۰
ابو ذر غفاریؓ، حضرت : ۱۰۵
ابو طالب مکی : ۶۹
اجمل، حکیم : ۳۷
احتشام الحق تھانوی : ۳۴
احمد بریلوی شہید، سید : ۱۸

احمد بن حنبل ، امام : ۹۵
احمد سعید : ۲۸
احمد علی لاہوری ، مولانا : ۳۵
ارسطو : ۱۵۹
اسٹالن : ۲۱۳
اسٹوری : ۲۰۳
اشتیاق حسین قریشی : ۳۵
اشرف علی تھانوی ، مولانا : ۳۳
اصغر گونڈوی : ۲۲۸ ، ۲۲۹
افلاطون : ۱۵۹
اقبال : ۵۰ ، ۵۸ ، ۵۹
اقبال ، علامہ شاعر اسلام : ۸۸ ، ۹۸ - ۱۰۱
اقبال حسین ، ڈاکٹر : ۱۳ ، ۲۰
اکبر (الہ آبادی) : ۹۳
الٰہی بخش : ۲۱۲
الفیلسوف الہندی (آزاد سبحانی) : ۵۶ ، ۸۵
امام الہند (ابوالکلام) : ۹۳
امام ربانی : ۹۹
امیر علی سید : ۱۸
انجلس : ۲۱۳
انصاری ، ڈاکٹر : ۳۸
انیس الرحمان : ۵۲
اے - این بلوچ ، ڈاکٹر : ۴۴
اے - این جین : ۱۳
این - اے بلوچ ، ڈاکٹر : ۱۶

ب

باپا گاندھی : ۲۱۳
(نیز ملاحظہ ہو گاندھی جی)
بایزید بسطامی ، سلطان عارفین :
(نیز ملاحظہ ہو سلطان العارفین) ۴۸
بدرالدین طیب جی : ۱۸
بدر عالم میرٹھی ، مولانا : ۳۵
برکت اللہ بھوپالی ، مولانا : ۱۸
بہادر یار جنگ ، نواب : ۸۸
بھولا بھائی ڈیسائی : ۸۸
بیتھمن ہالو ، ڈاکٹر ، چانسلر : ۲۰۷

پ

پروین روزینہ : ۴۶
پی - ہارڈی :
پیر شاہ محمد سلیمان ، ڈاکٹر : ۲۲۸

ت

تارا چند : ۴۷ ، ۱۰۵
تیج بہادر سپرو ، سر : ۸۸
تیمور : ۱۳۹

ٹ

ٹانگر (مجسٹریٹ): ۷۶ ، ۸۰ ، ۸۷
ٹراٹسکی : ۲۱۳
ٹفٹن : ۲۰۲

ث

ثاقب کانپوری : ۲۲۷
ثناء اللہ امرتسری : ۲۸

ج

جارج : ۲۳
جارج پنجم : ۲۳
جبریل : ۲۱۳
جلال الدین عمری ، سید : ۱۳
جمال میاں فرنگی محلی ، مولانا : ۳۳ ، ۳۵ ، ۹۶
جمیل احمد ، خواجہ : ۱۵ ، ۲۵، ۳۸ ، ۸۷ ، ۹۸ ، ۲۲۸
جمیلہ خاتون : ۱۲ ، ۳۳
جناح ، محمد علی : (نیز ملاحظہ ہو قائداعظم) : ۱۸ ، ۳۰ ، ۸۸
جواہر لال ، پنڈت : ۸۸
جوہر ، محمد علی ، مولانا : (نیز محمد علی جوہر) ۲۰ ، ۲۵
جیمس مسٹن ، سر : (نیز مسٹن) ۲۶ ، ۸۰

ح

حالی : ۳۹
حسرت موہانی ، مولانا : (نیز (رئیس الاحرار) ۸ ، ۱۸ ، ۳۳- ۳۸ ، ۳۲ ، ۸۸ ، ۹۸
حسن سبحانی : ۳ ، ۱۰ ، ۱۲ ، ۳۹ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳- ۱۰۷
حسن مثنیٰ ، مولانا : ۹۳
حسن نظامی ، خواجہ : ۱۳
حضور صلعم : ۱۰۰

خ

خضر ، حضرت : ۱۰۹
خلیق الزمان ، چودھری : ۲۹ ، ۳۵ ، ۱۰۲
خلیل الدین آزاد صمدانی ، مولانا: ۳۲
خیرالدین، مولانا (والد ابوالکلام): ۹۳

د

داؤد غزنوی : ۳۳ ، ۹۶

ذ

ذاکر حسین خان ، ڈاکٹر : ۳۹ ، ۹۰ ، ۹۱
ذوالقرنین : ۹۵

ر

رابعہ بصری : ۴۸ ، ۴۹
راج گوپال اچاریہ : ۸۸
راس مسعود ، سر : ۲۶ ، ۸۱
راغب احسن ، مولانا : ۳۲ ، ۵۱، ۹۳
راغب حسین ، مولانا : ۳۳
رحمت علی پنجابی ، چودھری : ۲۰۲

رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم)؛ ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۵ ، ۵۰ ، ٦۱ ، ۱۰۰
رشیدالدین سودودی ، سید : ۳۹
رضا علی ، سر : ۱۵ ، ۳۳
روم ، مولانا : ۵۸
رئیس الاحرار : ۸۸
رئیس احمد جعفری ، سید : ۱۵ ، ۳۳ ، ۸۷ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲
ریاض الحسن : ۲۲۸

ز

زار : ۲۳

س

سام : ۱۹۳
سائرس دی گروٹ : ۹۵
ستیہ مورتی : ۸۸
سرسید : ۳۹
سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم: ۵۰ ، ۸۵ ، ۱۰۰
سری نواس شاستری، سر : ۸۸
سلطان العارفین : ۸۷
سلطان ترکی : ۲۱ ، ۲۳ ، ۸۳
سلیمان پھلواروی : ۳۰
سلیمان ندوی ، مولانا سید : ۱۵ ، ۱۸ ، ۵۰ ، ۹۹
سوبھاش چندر بوس : ۸۸

ش

شاعر اسلام (اقبال) : ۸۸
شاعر حکیم شیراز (حافظ ؟): ۱۳۳
شائق احمد عثمانی ، مولانا : ۳۳
شاہ اسماعیل شہید دہلوی : ۱۸
شاہجہان بیگم، نواب والی بھوپال: ۳
شاہ سعود : ۹۷
شاہ عبدالعزیز ابن شاہ سعود : ۹۷
شاہ ولی اللہ : ۳۹
شبلی نعمانی ، علامہ : ۲٦ ، ۸۱
شبیر احمد عثمانی، مولانا : ۱۸، ۳۲
شریف‌الدین پیرزادہ : ۱۵ ، ۳۵
شمس الحسن ، سید : ۲۹
شوکت علی : ۱۸
شوکت علی ، مولانا : ۳۸ ، ۸۸
شہاب الدین سہروردی : ٦۹
شہنشاہ ایران : ۹۵
شیر بنگال : ۲۸
شیکسپیر کپتان : ۲۱۱

ص

صدیق احمد صدیقی ، حکیم : ۳
صلاح الدین ایوبی : ۲۰۸

ض

ضیاءالرحمان ، مولانا (اتاؤ) : ۵ ، ٦۹

ط

طفیل احمد منگلوری ، سید ۵۳ ، ۱۰۲
طیب ، مولانا (عرب عالم) : ۲

ظ

ظفر احمد ، مولانا : ۵۳
ظفر احمد انصاری : ۳۳
ظفر احمد عثمانی ، مولانا : ۳۳
ظفرالملک علوی ، مولانا : ۸۹ ، ۹۰
ظفر ، بہادر شاہ : ۱۷
ظفر علی خاں : ۵۰ ، ۸۸
ظفیر احمد ، میاں : ۳۰ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۵۷ ، ۵۷ ، ۹۳ ، ۱۰۰ ، ۱۰۶

ع

عابد حسین ، ڈاکٹر : ۹۰
عبدالاحد پیلی بھیتی ، مولانا : ۳
عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا : ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۸۳ ، ۸۳ ، ۸۵
عبدالباری ، مولانا : ۷ ، ۳۹
عبدالرحمان خاں منشی : ۳۵
عبدالرزاق ملیح آبادی : ۱۵
عبدالعزیز بن سعود شاہ : ۹۶
عبدالعزیز ربانی : ۱۳
عبدالقادر آزاد (لمز آزاد سبحانی) : ۱ ، ۲
عبدالقدیر بدایونی ، مولانا : ۹۸
عبدالکریم الجیلی : ۶۹
عبدالماجد بدایونی ، مولانا : ۱۸ ، ۲۸ ، ۳۳ ، ۸۸
عبدالمجید ، نواب : ۲
عبدالواحد سندھی : ۲۰۲ ، ۲۰۳
عبیداللہ سندھی ، مولانا : ۱۸ ، ۳۱ ، ۳۲
عرب : ۱۳۶
علی امام ، سر : ۲۷
علی برادران : ۱۹ ، ۳۸
علی اتقی : ۲۱۲
عنایت اللہ فرنگی محلی : ۳۳
عون جعفری ، کرنل : ۲۲۸
عیسیٰؑ (حضرت) : ۶۰

غ

غزالی ، امام : ۶۰ ، ۶۱
غزنوی (مولانا داؤد) : ۹۶
غلام احمد پرویز : ۹۳
غلام غوث ہزاروی ، مولانا : ۳۵
غلام مجتبیٰ جعفری پھلی شہری ، مولوی : ۲۲۸
غلام یحییٰ ، مولانا : ۵۷ ، ۸۵

ف

فاروق (شاہ مصر) : ۲۱۳
فرانسس : ۱۵

فرانسس رابنسن (انگریزی میں) :
۱۴ ، ۱۰۱
فرہاد : ۱۲۲
فضل الحق ۔ اے۔ کے، شیر بنگال :
۲۸
فضل حق بدایونی ، مولانا : ۱۸
فضل رحمان گنج مراد آبادی ،
مولانا : ۵
فیلسوف ہندی (آزاد سبحانی) :
۴۲

ق

قاری احمد پیلی بھیتی ، مولانا :
۱۴ ، ۴۶
قائداعظم : (نیز جناح) ۱۵، ۷۰ ،
۸۸
قیصر : ۲۵

ک

کاشانی : ۲۱۳
کرامت علی ، مولوی : ۱۸
کرم شاہ : ۲۱۲
کسریٰ : ۲۵
کفایت اللہ ، مفتی : ۲۸

گ

گالہ : ۱۳۶
گاندھی جی : ۷ ، ۸ ، ۳۵ ، ۳۶،
۸۸ ، ۱۰۴ ، ۲۱۳
گب : ۲۰۲ ، ۲۰۴
گلیلیو : ۹۵

ل

لارنس ، کرنل : ۲۱۱
لیفٹننٹ گورنر : ۲۲ ، ۸۰
لینن : ۲۱۳ ، ۲۱۸

م

مارکس : ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۲۱۳
۲۱۸
مجدد الف ثانی : ۶۹
مجدد ، شیخ سرہندی : ۷۸ ، ۷۹
مجنون : ۱۲۲ ، ۲۰۹
محسن خلیفۃ اللہ : ۱۱۵
محمد[3] عربی (نیز مصطفیٰ[3] ، رسول،
نبی[3]) : ۲۱ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۵۸ ،
۵۹ ، ۷۹ ، ۱۰۰ ، ۱۰۳
محمد اجمل خان ، حکیم : ۳
محمد اسماعیل خان ، نواب : ۲۹، ۳۰
محمد امین زبیری : ۴۵ ، ۱۰۲
محمد انوار الحسن شیرکوٹی : ۴۵
محمد سجاد ، شیخ : ۱
محمد سلیمان ، سر شاہ : ۲۶ ، ۸۰
محمد سلیمان ندوی ، سید : ۴۴
محمد شفیع مفتی ، مولانا : ۴۴
محمد صادق قصوری : ۱۳
محمد عبداللہ ، حافظ : ۴۵
محمد علی جوہر : ۴۹
محمد علی ، مولانا : ۱۸، ۲۶ ، ۳۸،
۸۱ ، ۸۲ ، ۸۸

محمد فاخرالہ آبادی ، مولانا : ۷
محمد قاسم نانوتوی ، مولانا : ۱۸
محمد مجیب ، پروفیسر : ۹۰
محمد مرتضوی ، شیخ ابن محمد سجاد شیخ : ۱
محمد میاں : ۴۵
محمد میاں ، سید : ۳٦
محمد یامین ، سر : ۱۵ ، ۲۹ ، ۳۴
محمود حسن ، مولانا : ۳۲
مختار احمد انصاری، ڈاکٹر : ۲۸
مرد قلندر (آزاد سبحانی) : ۹۸
مسٹن : ۲۳ ، ۲۴
مسیح : ۱۸۸
مشتاق احمد کانپوری ، مولانا : ۳
مشیر حسین قدوائی ، شیخ : ۱۹
مصدق : ۲۱۳
مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) : ۵۹ : ۸٦
مظہرالحق : ۲٦ ، ۸۰
مظہرالدین ، مولانا : ۹۸
معین‌الدین اجمیری ، مولانا : ۱۹ ۹۸ ، ۱۰۲
مفتی فلسطین : ۲۱۳
مفتی محمود ، مولانا : ۳۵
ملا رموزی : ۲۲۷
ملا شور بازار : ۲۱۲
ممتاز حسین : ۳۰
موپلا : ۳ ، ۳۱
موتی لال نہرو ، پنڈت : ۸۸
مودودی ، سید ابوالاعلیٰ ، مولانا ۵۰
مولانا آزاد سبحانی : ۹ ، ۷۹ ، ۸۲ ، ۸۳ - ۸۷ ، ۸۸ - ۹۱ ، ۹۲ ، ۹٦
مولانا روم : ۷۸ ، ۱۸۱
موہن مالویہ ، پنڈت : ۸۸
مہدی : ۱۸۸
میر جعفر : ۲۱۲
میر صادق : ۲۱۲

ن

نادر خان : ۲۱۲
ناظر حسین ، ایرسٹر : ۲٦ ، ۸۰
ناظرہ خاتون : ۱ ، ۱٦
نبی ، آخری (صلی اللہ علیہ وسلم) : ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۷
نثار احمد علوی ، حکیم : ۱۳ ، ۳۷ ، ۵۵ ، ٦۱
نجیب ، جنرل : ۲۱۳
نحاس (پاشا) : ۲۱۳
نذیر احمد خان ، چودھری : ۱۵ ، ۳۳
نظام الدین اولیا : ۱۸۱
نوح : ۱۹۳

و

وزیر حسن : ۲۷
وصی احمد محدث سورتی، مولانا: ۳

ہ

ہادی مچھلی شہری : ۲۲۸
ہارڈنگ ، لارڈ : ۲۷
ہٹلر : ۲۰۷
ہدایت اللہ : ۲ ، ۴

ی

یافث : ۱۹۷

کتب و جرائد

آ

آزادی سالا بار (رسالہ) : ۱۳ ،
۱۰۳

الف

احیاے علوم الدین : ۶۰
ارکان خمسہ : ۱۳
اعمال نامہ : ۱۵ ، ۴۴ ، ۱۰۱
اقیم الصلواۃ واتوالزکواۃ : ۵۱
اکلیات : ۱۳
الامان (رسالہ) : ۹۸
الانسان الکامل : ۶۹
العقائد : ۱۳
العلم: ۱۳-۱۶ ، ۴۴، ۴۵ ، ۴۶
المدینہ (ہفت روزہ) : ۱۵
الناظر : ۸۹
الڈین ڈیلی نیوز : ۸۶
انوار عثمانی : ۴۵
اوراق گم گشتہ : ۱۵ ، ۴۴
اے بیو گرافیکل ڈکشنری : ۱۴

ب

بائیبل : ۱۴۰
برطانوی انڈیا کے مسلمان : ۴۵
برگ گل ، مجلہ (قائداعظم نمبر) :
۱۵ ، ۴۴
بنگلہ ترجمہ (سیرت محمدی) : ۱۳

ت

تاریخ ہند و پاک : ۱۴ - ۱۶، ۴۶
تبصرات سبحانی : ۹۹
تحریک شیخ الہند : ۴۶
تحقیقات : ۱۴ - ۱۶ ، ۴۳ - ۴۶ ،
۷۹ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲
تحقیقات اسلامی : ۱۳
ترجمان القرآن : ۹۵
تعمیر پاکستان اور علماے ربانی :
۴۵
تفسیر ربانی : ۱۳ ، ۵۰
تفسیر (القرآن) : ۵۰
جمعیت علماے ہند : ۳۳ ، ۴۱
جمعیت العلماء ہند : ۴۶
جنگ ، روزنامہ : ۵۳، ۷۹، ۱۰۲

چ

چند یادیں : ۱۵ ، ۱۶، ۴۳، ۴۴،
۴۶ ، ۵۳ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲،
۲۲۹

ح

حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق : ۴۳ ، ۴۶ ، ۱۰۱

حکومت الٰہی اور خلافت ربانی : ۴۸ ، ۵۳

حیات شبلی : ۱۵ ، ۴۴

د

داستان پاکستان : ۱۵ ، ۴۴

دعوت : ۹ ، ۱۰ ، ۴۸ ، ۴۹

دی ٹیچنگ آف اسلام ان دی لائٹ آف ربانیہ ، (انگریزی) : ۱۳

دید و شنید : ۱۵ ، ۴۴ ، ۱۰۲

ذ

ذکر آزاد : ۱۵

ر

ربانی لفظیں : ۱۱۶

ربانیت (رسالہ) : ۱۰ ، ۴۹

روح الاحادیث : ۹۹

روحانیت ، ماہنامہ : ۹ ، ۹۸ ، ۹۹

ز

زبور ربانی : ۱۳ ، ۵۱

زبور ربانیت: ۱۶۰ ، ۱۶۲ ، ۱۶۷ ، ۱۶۸

س

سفر نامۂ ربانی : ۱۰۷ - ۱۱۳ ، ۱۲ ، ۱۲۸ ، ۱۳۱ ، ۱۳۳ ، ۱۵۸ ، ۲۰۴ ، ۲۲۵

سفرنامہ یورپ اور امریکہ : ۱۳

سلیمان ندوی ، سید : ۴۴

سیاستِ ملیہ : ۳۵ ، ۱۰۲

سیپریٹزم امنگ الدین مسلمز (انگریزی) : ۱۴ ، ۴۴ ، ۴۶ ، ۱۰۱

سیرت مہدی[۳] : ۱۳

سیرت مہدی[۳] (انگلہ ترجمہ) : ۱۳

ش

شاہراہ پاکستان : ۳۵ ، ۱۰۲

شب چراغ : ۱۴ - ۱۶ ، ۴۳ ، ۴۶ ، ۵۹ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۶

ص

صحیفۂ الٰہی : ۷۳

صوت الاسلام (ہفت روزہ) : ۱۵

ط

طلوع اسلام : ۹۴

ع

علماء ان پالیٹکس : ۳۵

علی برادران : ۱۰۱

عوارف المعارف : ۶۹

ف

فاؤنڈیشن آف پاکستان : ۱۵ ، ۳۵ ، ۶۴

فصوص : ۶۹

فلسفۃ الربانیہ : ۱۳

فلسفۂ ربانی : ۱۹۰

ق

قرآن : ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۸-٦۰، ۹۵،
۱۱۹ ، ۱۲۰

قرآن پاک : ۲۲

قرآن حکیم : ۱۷

قوت القلوب : ٦۹

ک

کاروان گم گشتہ : ۱۰۲

کتابی دنیا ، ماہنامہ ، ۱۴

کلام الہدیٰ : ۵۵

کلیات دین : ۱۳ ، ۱۸۹

کیمبرج (کتاب) : ۴۵

م

مجلس دعوت الحق : ۴۵

مسلمانوں کا روشن مستقبل : ۴۵
۱۰۲

مسلمز ان انڈیا : ۱۴

مسودات ڈاکٹر بلوچ : ۴۴ ، ۴٦

مشاہیر ہند مقالہ : ۱۴

معارف ، ماہنامہ : ۲۲۹

معلومات ، ماہنامہ : ۱۵

معین النطق : ۱٦، ۲ ۱

مقدمہ تفسیر ربانی : ۱۳

مقدمہ علم القرآن : ۱۳، ۵۰، ۵۱

مکتوبات (امام ربانی) : ٦۹

مکتوبات سبحانی : ۹۹

ملفوظات سبحانی : ۹۹

موبلا ، رسالہ : ۱۳ ، ۱۰۳

مولانا آزاد سبحانی ، مقالہ : ۱۳

مولانا آزاد سبحانی ، حیات و
نظریات : ۱۳

موومنٹ ان انڈیا : ۴۳

مہر لیم روز : ۹۰

ن

نامۂ اعمال : ۱۵ ، ۴۴

ندائے ملت ، روزنامہ : ۴۴

نقوش ، ماہنامہ : ۱۴

نوائے وقت ، روزنامہ : ۴۵

نہرو رپورٹ : ۸۹

نیشنل آرکائیوز : ۸۴ ، ۱۰۱

ہوم ڈیپارٹمنٹ پول : ۸۴ ، ۱۰۱

ہسٹری آن دی فریڈم موومنٹ: ۱۰۵

ہسٹری آف فریڈم : ۴۳

تحریکات و مذاہب وغیرہ

آ

آریا سماج : ٦
آل انڈیا خلافت کانفرنس : ۷، ۲۹

ا

احیائے حکومت الٰہی اور خلافت ربانی : ۵۱
اخوان المسلمین : ۲۱۳
اسلام : ٦ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۷۱ ، ۱۰۵ ، ۱۰٦ ، ۱۱٦ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۲۹ ، ۱۸۰ ، ۱۹۷ ، ۱۹۸ ، ۲۱۱ ، ۲۲۱
اشتراکیت : ۵۲ ، ۱۰۳ ، ۱۱۷ ، ۱۱۸ ، ۱۲٦ ، ۱۵۸ ، ۲۱۳ ، ۲۱۴ ، ۲۱۸
اکلنسٹ : ۱۵۴
انجمن خدام کعبہ : ۸۲
ایسٹ انڈین ریلویز : ۱۱

ب

برطانوی سیاست : ۱۹

ت

تحریک آزادی : ۱۷ ، ۲۹
تحریک پاکستان : ۱۷ ، ۹۳ ، ۹۵
تحریک ترک موالات : ۸ ، ۲۹
تحریک حکومت الٰہی اور خلافت ربانی : ۵۰
تحریک خلافت : ۷ ، ۸ ، ۲۷ ، ۲۹ ، ۸۱
تحریک دعوت : ۷ ، ۳٦
تحریک ربانی : ۱۰ ، ۳۷ ، ۳۹
تحریک ربانیت : ۱۱۵ ، ۱۳۳ ، ۱۵۸ ، ۲۱۵
تحریک عدم تعاون ، (نیز عدم تعاون) : ۲۷
تحریک قیام پاکستان : ۸ ، ۳۵
تحریک نمک سازی : ۷
ترک موالات : ۳۵ - ۳۷ - ۴۰
تقسیم بنگال : ۱۹
تھیاسوفسٹ : ۱۵۴

ج

جمعیت الاسلام : ۳۲
جمیعۃ العلما : ۴۰

جمعیۃ العلماء اسلام : ۱۰۸، ۱۰۹
جمعیۃ العلماء ہند : ۳۲ - ۳۴،
۱۰۸
جمعیت ربانیہ (تحریک) : ۹ ، ۳۸
جمعیت علمائے اسلام : ۳۲ - ۳۴
جنگ آزادی : ۱۷
جنگ عظیم اول : ۳۹

چ

چرچ ارگنایزیشن : ۱۱۹ ، ۱۲۰

ح

حزب الربانین : ۱۱۵
حکومت الہٰی اور خلافت ربانی :
۵۰-۵۲
حلقہ ادبیہ : ۲۸

خ

خلافت (تحریک) : ۳، ۳۶، ۳۸-
۴۰ ، ۳۹
خلافت ربانی : ۵ ، ۳۶ ، ۳۸ ،
۵۱ ، ۱۱۵
خلافت ربانی پارٹی : ۵۲
خلافت ربانی ، تحریک : ۱۰۵
خلافت کانفرنس : ۳۷
خلافت کمیٹی : ۷ ، ۴۰

د

دعوت ربانی : ۱۱۸ ، ۱۱۹
دعوت مہدی : ۱۳۲ ، ۱۳۳

ڈ

ڈالڈی مارچ : ۸ ، ۳۵

ر

ربانی ایسوسی ایشن : ۱۱۵
رسالت حضرت محمدیت : ۱۵۲
رسالت عیسوی : ۱۵۲
رسالت موسوی : ۱۵۲
ریشمی خطوط (تحریک) : ۴۳

س

سنگھٹن (تحریک) : ۸ ، ۳۵
سوشلزم : ۱۰۳ ، ۱۰۵
سول نافرمانی : ۳۷

ش

شدھی (تحریک) : ۸ ، ۳۵

ع

عدم تعاون (تحریک) : ۸ ، ۲۸ ،
۳۵ ، ۳۶ ، ۴۰
عقیدۂ ربانیت : ۱۸۵
عیسائیت : ۱۱۹ ، ۱۹۷ ، ۱۹۸

ف

فلسفۂ ربانی (تحریک) : ۱۱۷ ،
۱۱۸ ، ۱۶۶
فلسفۂ ربانیت : ۶۶ - ۶۸ ، ۷۰ ،
۷۱
فلسفۂ ربانیہ : ۱۰۹ ، ۱۱۳ ،
۱۱۵ ، ۱۷۰ ، ۲۰۰

ک

کانگرس : ۷ ، ۱۰ ، ۲۸ ، ۲۹ ،
۳۱ ، ۳۳ - ۳۶ ، ۳۸ ، ۸۸ ،
۹۲ ، ۹۷ ، ۱۰۷ ، ۱۰۸
کمیونزم : ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۱۵۸ ،
۲۱۳ ، ۲۱۴
کمیونسٹ پارٹی : ۱۰۶
کمیونسٹ تحریک : ۱۰۴

م

مارشل لا : ۳۰
مارکسزم : ۱۰۳ ، ۱۰۵
مجلس دعوت الحق : ۳۳
مرا اسلامی یونیورسٹی : ۱۰
مرکزی ربانی انجمن : ۱۵
مسلم لیگ : ۶ ، ۸ ، ۲۸ - ۳۲ ،
۳۳ - ۳۷ ، ۳۱ ، ۵۲ ، ۸۸ ،
۹۳ - ۹۵ ، ۹۷ ، ۱۰۷ - ۱۰۹ ،
۱۴۱
مطالبۂ آزادی : ۸
مطالبۂ پاکستان : ۳۲

موپلا ریلیف فنڈ : ۳۱
مودت بین الادیان، تحریک : ۱۱۹

ن

نظریۂ ارتقائیت : ۵۱
نظریۂ اکمالیت (تکملیت) : ۵۱
نظریۂ اجمالیت : ۵۱
نظریۂ پاکستان : ۳۰
نظریۂ حقائیت : ۵۱
نظریۂ رہائیت : ۵۱ ، ۲۰۰
نظریۂ عالمیت : ۲۰۰
نظریۂ عرفانیت : ۵۱
نظریۂ وارثیت : ۵۱
نظریۂ وحدانیت : ۵۱
نمک سازی ، تحریک : ۳۶

ہ

ہندو کانگرس : ۹۲
ہندو مسلم اتحاد : ۸

ی

یہودیت : ۱۹۷ ، ۱۹۸

مقامات و ادارہ جات

آ

آزاد میدان (کلکتہ) : ۹۳
آسٹریلیا : ۱۴۶
آکسفورڈ یونیورسٹی: ۲۰۲، ۲۰۳
آگرہ : ۳۵، ۱۰۲
آئرستان : ۲۰۵

ا

اٹلی : ۱۹، ۲۳، ۱۳۷، ۱۴۶، ۱۹۸، ۲۰۸، ۲۱۸
اجمیر : ۳۱
احمد آباد : ۳۷
اردو کالج کراچی : ۱۵، ۴۴
اسپین : ۱۳۷، ۱۹۵، ۲۰۸
استقلال پریس : ۳۶
اسکاچستان : ۲۰۵
اسکنڈی نیویا : ۱۳۷
اسلام آباد : ۳۶
اسلامستان در ہالستان : ۹، ۳۸
اسلامی دنیا : ۲۱۰
اسلامی ہند : ۸۸، ۹۸
اشتراکی روس : ۲۱۰
اعظم گڑھ : ۱۵، ۴۴، ۲۲۹
افریقہ : ۱۳۴
افریقیہ : ۱۴۶
افغانستان : ۱۹۵، ۲۱۲
الہ آباد : ۳۱، ۸۸، ۲۲۸
امرتسر : ۳۱
امروہہ : ۳
امریکہ : ۱۳، ۵۶، ۸۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۳۴، ۱۳۵ - ۱۳۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۷۰ - ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۰ - ۱۸۲، ۱۸۷، ۲۰۵، ۲۱۰، ۲۲۰ - ۲۲۳
اناؤ : ۵
انڈونیشیا : ۱۴۹
انڈیا آفس لندن : ۴۳، ۳۶
انگلستان : ۲۸، ۱۵۷، ۱۶۷، ۱۹۸، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹-۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۶ - ۲۱۹، ۲۲۳
ایتھر : ۱۰۵، ۱۵۶
ایران : ۱، ۹۵، ۱۹۹، ۲۱۳

ایسٹ انڈین ریلویز : ۹۶
ایشیا : ۱۱ ، ۶۰ ، ۹۶
ایمن : ۲۲۹
ایورسٹ چوٹی : ۱۳۹

ب

بحرالکاہل : ۲۲۰
بحر اوقیانوس : ۲۲۰
بدایون : ۳۵ ، ۱۰۲
براعظم : ۲۲۰
براعظم (افریقہ) : ۱۷۶
براعظم ایشیا : ۱۷۶
براعظم یورپ : ۱۷۶
برصغیر : ۸ ، ۲۰ ، ۳۲ ، ۳۶ ، ۵۰ ، ۵۷ ، ۸۱
برطانیہ : ۲۶ ، ۲۷ ، ۳۸ ، ۸۱ ، ۸۳ ، ۱۳۳ ، ۱۳۷ ، ۲۰۵
بریلی : ۳
بگہا : ۱۲
بلجیم : ۱۳۴
بلقان : ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۳ ، ۸۲ ، ۲۱۰
بلقانی ریاستیں : ۱۳۷
بلوچستان : ۱۹۵
بلیا : ۱
بمبئی : ۷ ، ۳۹ ، ۹۶ ، ۱۶۸
بنگال : ۱۹ ، ۳۳ ، ۵۲ ، ۵۳ ، ۹۵
بنگلہ دیش : ۵۲
بہار : ۲۷ ، ۵۳ ، ۸۲ ، ۸۶
بہار جنوبی : ۱۲
بہار شمالی : ۱۲
بھارت : ۹۰
بھرت پور : ۶ ، ۸۶
بھوپال : ۳
بیت المقدس : ۲۸

پ

پاکستان : ۶ ، ۸ ، ۹ ، ۱۵ ، ۱۷ ، ۲۸ ، ۳۰ ، ۳۲ ، ۳۵ ، ۳۲ ، ۴۳ ، ۵۰ ، ۵۲ ، ۵۳ ، ۸۸ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۵ ، ۱۰۸-۱۱۰ ، ۱۲۰ ، ۱۶۳ ، ۱۷۱ - ۱۷۳ ، ۱۹۳ ، ۲۰۱ ، ۲۱۳ ، ۲۲۳
پرتگال : ۱۳۴
پنجاب : ۹۳
پولینڈ : ۱۲۵ ، ۱۳۶
پیرس یونیورسٹی : ۲۱۹
پیلی بھیت : ۳

ت

ترکستان : ۱۷۶ ، ۱۹۵ ، ۱۹۸
ترکی : ۲۱ ، ۲۳ ، ۲۳ ، ۷۹ ، ۸۳ ، ۱۲۳ ، ۱۹۵ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ، ۲۱۸

ج

جاپان : ۱۷۶
جامعہ الازہر : ۵۵ ، ۸۵
جامعہ الثہوات : ۵۷ ، ۸۵

جامعہ ملیہ : ۳۹ ، ۴۲

جامعہ ملیہ اسلامیہ : ۹۰

جدہ : ۹۶ ، ۹۷

جرمنی : ۱۷۶، ۲۱۰، ۲۱۷-۲۱۹

جزیرۃ العرب : ۴ ، ۳۹

جلت : ۷۹

جنوبی اسپین : ۱۳۶

جنوبی امریکہ : ۱۷۶ ، ۲۲۰

جنوبی ایشیا : ۵۰

جنوبی فرانس : ۱۳۶

جونپور : ۲ ، ۴

چ

چمن گنج : ۳۷

چین : ۱۲۴ ، ۱۷۰-۱۷۶، ۲۱۱، ۲۱۳

ح

حجاز : ۱۰ ، ۱۱ ، ۹۶ ، ۲۲۵

حرم : ۱۶۲

حرمین شریفین : ۸۶

خ

خانہ کعبہ : ۱۹

د

دارالعلوم دیوبند : ۳۳

دارالعلوم ندوۃ العلما : ۸۹

دشت عرب : ۱۳۴

دوزخ : ۹۴

دہلی (نیز نیو ڈہلی) : ۹ ، ۱۵ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۴۵ ، ۹۰ ، ۲۱۷

دیار مغرب : ۱۶۱

دیوبند : ۳۲-۳۴

ڈ

ڈھاکہ : ۱۰۸

ڈیری آنسون : ۱۲

ر

رامپور : ۲

راولپنڈی : ۷۹

روس : ۱۲۴ ، ۱۵۴، ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۷۴ - ۱۷۶ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ، ۲۱۳ ، ۲۱۴

روشن باغ : ۲۲۸

روضۂ نبوی : ۱۹

روما : ۱۳۶

ز

زیکو سلاویکیا : ۱۹۵

س

سائبیریا : ۱۳۴-۱۳۶

سبزوار : ۱

سرادیپ : ۱۹۸

سعد آباد : ۲۱۰

سکندر پور : ۱ ، ۱۱

سندھ : ۱۵

سنہستان : ۱۹۵

سودیشی سٹور : ۷۶

سوراج بھون : ۸۸

سوئیزر لینڈ : ۱۷۹ ، ۲۱۸

ش

شام : ۱۲۴ ، ۱۹۵ ، ۲۱۶

شامیستان : ۱۹۵

شمالی افغانستان : ۱۳۴ ، ۱۳۵

شمالی امریکہ : ۱۷۶ ، ۲۲۰

شمالی ایران : ۱۳۴ ، ۱۳۵

شمالی ہند : ۸۳

شمالی ہندوستان : ۸۴

شیراز : ۱۳۳

ص

صحرائے اعظم (افریقہ) : ۱۷۴

صوبہ متحدہ : ۲۸

ع

عرب : ۲۵ ، ۵۶ ، ۸۵ ، ۹۷ ، ۱۹۷ ، ۱۹۸ ، ۲۱۰ ، ۲۱۸

علی گڑھ : ۱۳ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۹۲ ، ۲۰۷

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی : ۳۸ ، ۳۹

عید گاہ (کانپور) : ۸۳

ف

فرانس : ۱۳۴ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۹۵ ، ۱۹۸ ، ۲۰۸ ، ۲۰۹ ، ۲۱۲ ، ۲۱۶-۲۱۸

فرنگی محل : ۳ ، ۳۲ ، ۳۴

فلسطین : ۱۲۴ ، ۱۹۵ ، ۲۱۳

فن لینڈ : ۱۳۴

فیض آباد : ۹۸

ق

قاہرہ : ۵۷ ، ۸۵

قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت : ۳۶

ک

کاکہشیا : ۱۹۸

کالڈیا : ۱۹۸

کانپور : ۵ ، ۶ ، ۱۱ ، ۱۹-۲۲ ، ۲۴ ، ۲۷ ، ۳۳ ، ۳۷ ، ۴۰ ، ۴۳ ، ۵۷ ، ۶۹ ، ۸۰-۸۶ ، ۱۰۱

کانپور مسجد : ۴۷

کتاب منزل لاہور : ۱۰۲

کچی باغ : ۱۲

کراچی : ۱۳-۶ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۶ ، ۵۲ ، ۵۳ ، ۱۰۲

کشمیر : ۱۹۵

کعبہ : ۲۷ ، ۸۲

کلکتہ : ۷ ، ۱۰ ، ۱۵ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۹۲-۹۶ ، ۱۰۸

کلی اورینا : ۱۷۴

کیمبرج : ۲۰۲

کیمبرج یونیورسٹی : ۲۰۳

گ

گورکھپور : ۹ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۴۷ ، ۹۸

گومتی (دریا) : ۳

ل

لاہور : ۱۴ ، ۱۵ ، ۴۴ - ۴۶ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲

لبنان : ۱۹۵

لکھنؤ : ۳ ، ۱۰ - ۱۲ ، ۲۶ ، ۲۹ ، ۴۳ ، ۴۹ ، ۸۰ ، ۹۳ ، ۹۶ ، ۱۰۵ ، ۲۱۷

لندن : ۱۱ ، ۲۶ ، ۴۳ ، ۴۶ ، ۸۱ ، ۱۲۰ ، ۲۰۲ ، ۲۲۱

م

مالا بار : ۴۰

مچھلی بازار (کانپور) : ۸۰ ، ۸۳ ، ۱۰۱

مچھلی بازار (مسجد) : ۲۱ ، ۲۶ ، ۲۷

محمد بن قاسم روڈ (کراچی) : ۱۳

محمد علی اکیڈمی : ۴۴ ، ۱۰۱

محمد علی ہوسٹل : ۹۱

مدرسۂ الٰہیات : ۲۰ ، ۴۷ ، ۶۸ ، ۸۶

مدرسۂ عالیہ : ۲۰

مدینہ : ۹۷ ، ۱۹۷

مراسلاتی یونیورسٹی : ۱۰ ، ۴۹

مسٹن روڈ (کانپور) : ۲۱ ، ۸۰ ،
۸۲

مسجد (مچھلی بازار) : ۸۱ ، ۸۲

مسجد الہیہ (کانپور) : ۸۱

مسجد فتحپوری : ۲۸

مسجد مچھلی بازار کانپور : ٦ ،
۱۱ ، ۱۹

مسلم یونیورسٹی : ۹۲

مشرق (دلیائے) : ۱۰۵ ، ۱۱۱ -
۱۱۳ ، ۱۱٦ ، ۱۱۵ ، ۱۲۱ -
۱۲۸ ، ۱۲۹ - ۱۳۲ ، ۱۳۳ -
۱۴۳ ، ۱۴۵ - ۱۵۲ ، ۱۵۳ -
۱۵۹ ، ۱٦۲ ، ۱٦۷ ، ۱۸۵ ،
۱۹۱ - ۱۹۵ ، ۱۹٦ - ۲۰۱ ،
۲۰۵ - ۲۰۸ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ،
۲۲۰ ، ۲۲۲ - ۲۲۳

مشرق اردن : ۱۹۵

مشرق وسطیٰ : ۸۳

مشرق پاکستان : ۵۲

مشرق دنیا : ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ،
۱۹۳

مشرق یوپی : ۸٦

مشرق یورپ : ۱۳۹

مصر : ۱۰۷ ، ۱٦۳ ، ۱٦۷ ،
۲۱۸ ، ۲۱۹

مغرب (دلیائے) : ۱۰۵ ، ۱۰۸ ،
۱۱۱ - ۱۱۳ ، ۱۱٦ - ۱۱۸ ،
۱۲۱ - ۱۲۵ ، ۱۲٦ - ۱۲۷ ،
۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ - ۱۳۰ ،
۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳٦ -
۱۵۰ ، ۱۵۱ - ۱۵۸ ، ۱٦۰ ،
۱٦۱ - ۱٦۳ ، ۱۸۵ ، ۱۹۱ -
۱۹۵ ، ۱۹٦ - ۱۹۹ ، ۲۰۱ ،
۲۰۵ - ۲۰۸ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ،
۲۱٦ - ۲۱۸ ، ۲۲۰ ، ۲۲۲ -
۲۲۳

مغربی دنیا : ۱۸۹ - ۱۹۱ ، ۱۹۳ ،
۱۹۳

مغربی روس : ۱۳٦

مکتبۂ محمودیہ : ۳٦

مکہ : ۲۳ ، ۹۷

مکہ معظمہ : ۹٦

ن

نازی جرمنی : ۲۱۰

لا کھور : ۳۱

وۃ العلماء لکھنؤ : ۲۹ ، ۳۲

نظام پور : ۱۲

نیشنل پبلشنگ ہاؤس : ۵۳

نیو ڈیلی (نیز دہلی) : ۸۳

نیو پارک : ۱۲۰ ، ۲۲۱

و

وادی ایمن : ۲۲۹

واشنگٹن : ۲۲۱

وسطی ایشیا : ۱۹۸

ویلزستان : ۲۰۵

ہ

ہالینڈ : ۱۳۷ ، ۱۹۷

ہالستان : ۱۹۳ ، ۲۰۱ ، ۲۰۲ ، ۲۱۷

ہمالیہ : ۱۳۹ ، ۱۵۰

ہند : ۲۱ ، ۳۱ ، ۳۲، ۷۹، ۸۲، ۱۰۳ ، ۱۰۸ ، ۱۴۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۳

ہند و پاک : ۴۲

ہندوستان : ۱۰ ، ۱۴، ۱۸، ۲۳ ، ۲۵ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۴۳ ، ۴۹ ، ۸۸ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۱۰۳، ۱۰۶ ، ۱۲۰ ، ۱۶۳ ، ۱۶۴ ، ۱۴۱ - ۱۴۳ ، ۱۹۳ ، ۲۰۱ ، ۲۱۳ ، ۲۱۴

ہنگری : ۱۵۶

ی

یاغستان : ۱۹۵

یوپی : ۵ ، ۲۶ ، ۲۹ ، ۳۵، ۳۹، ۴۰ ، ۸۰ ، ۸۲ ، ۸۳

یوپی مشرق : ۱

یورپ ، ۱۱ ، ۱۳ ، ۵۶ ، ۶۰ ، ۸۵ ، ۹۹ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۱۱۲ ، ۱۳۳ ، ۱۶۰ - ۱۶۲ ، ۱۶۴ ، ۱۴۰ - ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۵۶ ، ۱۵۵ ، ۱۸۰ - ۱۸۲ ، ۱۸۵ ، ۲۲۲

یونان : ۱۳۲، ۱۹۵، ۲۰۸، ۲۱۴

یونین ہال (علی گڑھ) : ۹۲

INDEX

A

Abdullah Uthman al-Sindi, 3, 5
Allah, 5,7,11-15,16-20,21,23,27,29-32
America, 2
Ashaari, 5,10
Azad Subhani, Maulana, 1,2

C

Cawnpur, 1
Columbia University, 3,5

G

Ghazali, 5

I

India, 1,5
Indian Nationalism, 2
Islam, 1,4,5,10-12,15,24,25,32

M

Madrasah-e-Ilahiyat, 1
Manifesto of *Rabbaniyyat*, 2
Middle East, 2

P

Philosophy of *Rabbaniyyat*, 2,4, 5,32

R

Rabbani Association, 32
Rabbani Group, 32
Rabbani Movement, 4, 32
Rabbaniyyat, 2
Rabbaniyyin, 32

S

Sayyid Al-Mursalin 5
Skindarpur, 1
Subhani, 5
Subhani Rabbani, 5

U

United Provinces, 1
Universe, 11-15, 16-20, 27-32

W

Western Europe, 2

Chapter VI

ONE GREAT MISSION OF ISLAM

One great mission of Islam is to guide makind to the way of *Rabbaniyyat*: to make man observe himself unto, and identify with, the *Rububiyyat* of the Universe by means of knowledge, zeal and action, under the *Rabbiyyat* of ALLAH.

Chapter VII

THE RABBANI MOVEMENT

The object of the Rabbani Movement is to serve the cause of Islam in the fulfilment of its great mission of *Rabbaniyyat* by man.

This object is to be achieved through the propagation of the Philosopy of *Rabbaniyyat*. The purpose of this philosophy is to give impetus to the Rabbani Movement : make it strong and effective, and keep it progressing. Its initial object is to create Rabbani groups and Rabbani associations in every suitable nook and corner of the globe.

Its first and the final appeal to makind is :

KUNU RABBANIYYIN

"Oh ! People, become Preservers"

---

greates achievement to be man : and he should be man only, so that he may stand high above the whole Universe, while Allah stands over and above him.

But this is easily possible for him only in one way; becoming a *Rab-bani* and adopting the principle of the way of *Rabbaniyyat* (work of preservation). *Rabbaniyyat*, in its true form, means, absorbing ones ownself into Allah and assimilating the *Rabbaniyyat* of Allah into one's ownself for the acquisition of *Rabbiyyat* Allah's quality with the *Rabbaniyyat* of the Universe, according to the laws of *Rububiyyat* of Allah, to remain and act continuously under the guidance of the laws of *Mashiyyat*.

Rabbani is one who reaches this stage or tries his best continuously and constantly to reach this stage.

Therefore, naturally as well as by the commandment of Allah, man has got twofold duties and responsibilities : his duties and responsibilities arising out of his relation with Allah and his duties and responsibilities arising out of his relation with the Universe. He has to carry out these twofold duties and responsibilities, maintaining at the same time a proper balance between his relations with Allah and the Universe. He can discharge these duties and maintain this balance only under the guidance of two factors ; guidance of his own real and deep nature which is a kind of individualistic instinctive and interior religion; and the guidance of the exterior religion, which is the common, complete and universal guidance.

However, the maintenance of this balance *is* of basic importance to man's position *of Khilafat* (Viceroyalty of Allah). It is the basic value and the measuring standard(a thermometer)of the values of man himself. If he maintains this balance, he attains the position of normal and natural man, complete and successful man. But if he shifts this balance his position changes ; he becomes angel when his weight is on the positive side. That is when his relation with Allah overwhelms his relation with the Universe, and he becomes devil when the weignt is on the negative side. That is, when his relation with the Universe supercedes his relation with Allah. But, if he loses this balance he becomes an animal ; then his relation to his own self supercedes his relation to Allah as well as to the Universe. The proper maintenance of this balance is *Rabbaniyyat,* the responsibility with which he has been entrusted.

Man, by his quality of comprehensiveness, change and adjustment can make himself anyone of the four :— a man, an angel, a devil or an animal. But he should know that man is greater than and superior to either angel, devil, or animal as well as the rest of the whole Universe. Therefore, it is his

Chapter V

INSAN and ALAM (Man and the Universe)

The latest and the ablest species in the continuous evolution of the Universe is Man. Man's peculiar nature lies in his all-inclusive nature. His nature comprehends the essence of the whole Universe. His creation is the combination of all kinds of essential elemets of the Universe. He is a universe in miniature within himself and as such comparatively the ablest and the most complete of all Divine manifestations.

It is on this account that he has been given the status of *Khalifatullah* (Deputy of Allah), exclusively : a status which is not shared by any other being of the Universe beside him. This is because Man has got the privilege of being the special manifestation of Allah; and as such he is also in a position to achieve unison with Allah Himself, and not merely with His surroundings. Due to this great potentiality of man, he has been also given the title of *Rabbani*, which literally means a *rabb* under the *Rabb*; in explanatory phase it means a subordinate *rabb* under the command of the Supreme *Rabb*, who is *Rabbal-Alameen*, (the Preserver of the Universe). He has been assigned this high position so that he may perform his duty of *Rabbaniyyat*, (act of preservation by man) for the whole Universe, as the highest tool and the greatest servant of Allah. This is the meaning of his being *Khalifatullah* : *Khalifa* means, an agent, a deputy, or a viceroy; and therefore the man is the Deputy of Allah on Earth. As such he is the ruler of all but the servant of One, the Supreme Ruler, Allah.

stages and grades. In the first grade there are head soul, who are four in number; Jebrail Meikail, Izrail and Israfil.

They are entrusted with four separate departments of the universal work of *Mazhariyyat* (manifestation), and *Rububiyyat* in the initial stage. Their work extends to the whole Universe through their agents or sub-souls.

Above these four souls also there are some souls equal to the fixed number of seats they occupy. They are the bearers of *Arsh*, which is matter of primary stage in the Universal position; it is the material part of the Universe, and the final stage of material attainment. It is also the position from which nearness to Allah in the highest position of reality can be attained. After the attainment of this position only two degrees remain between man and Allah, viz. the Universal Soul and the Attributes of Allah.

These souls give their energy to hold up the *Arsh*, and *Arsh* depends and rests upon their energies. This is because they are souls, while the *Arsh* is matter of primary condition, and Matter is evidently weaker than the soul.

Chapter IV

ALAM—THE UNIVERSE

Allah, beside Himself, has an endless series of manifestations which constitute what is known as "Alam" (the Universe).

Alam, in spite of its infiniteness, is confined to four generalities; namely, Soul, Matter, Time and Space. All these four are the first and the initial manifestations of Allah, but they are in this order that, Soul is the first manifestation. Matter the second and Time and Space the third, and the fourth respectively. The manifestation of Soul is the source of all the beings of the Universe having soul and matter; while the manifestation of Matter is the source of all the material beings.

Source of Soul in the Self of Allah, is His quality of *Hayat* (life and breath); source of Matter in Him is His quality of *Qudrat* (power and energy); source of Time in Him is His *Mashiyvat* (will) and the source of Space in Him His *wus'at* (infiniteness).

Soul is the tool of service to Allah in the manifestation of Matter, Time and Space. Time is the tool of service to Allah in the manifestation of Space; and all the four are tools of service to Allah in the whole manifestation of Universe and all that is beyond and beside it.

Soul is of two kinds; universal and local. The Universal Soul is only one but the local one has countless number of souls in its category. These numerous souls of local category have

"Religions" were in fact parts of one common universal religion of Islam ; they were all its partial manifestations in various times and in various countries in accordance with the evolutionary life of the human race satisfying the needs of the time and place. The last and the complete manifestation of the religion to the matured humanity was Islam.

The most common, practical and idealistic theory of Islam is the *theory of Rabbaniyyat* (preservation on the part of man), which must be accepted by everyone in this natural and common way of life.

---

cannot be precisely determined; but that does not matter. Life is eternal and those who strive towards the goal are sure to reach it. A short span of life in this world need not deter anyone who is wise from striving to achieve his goal. For this life is only one life or only a small part of the eternal life

Religion provides guidance for the journey towards Allah. If religion does not do this, it is not of any worth and value. From this point of view *tas awwuf* (mysticism) becomes the spirit and the soul of religion provided its guiding program me is not contrary to the program of the ordinary life which is also real and important. For, our apparent life on earth has got existence and every existence is a manifestation of Allah, and as such, it cannot be unnecessary or unimportant.

Religious life is, however, of utmost importance. But you might ask which religious life to follow ; because religions are many and the choice is difficult.

But you should understand one great truth that religion is only one. The name of this one complete and perfect religion is Islam Islam ordains worship and devotion to no other being except One Complete Being, ALLAH, whatever and wherever He may be.

Islam is not the possession of any one person, nation or country; it is not confined to any one period of time or any one particular aspect of life ; but being the religion of Allah, it is like Him and His nature, general, universal and eternal; it is the common way of life leading to communion with Allah.

Islam is not the religion of any particular Prophet, but it is the religion of Allah only. All the Prophets were the teachers and preachers of one particular aspect of it, and all holy books are only its revelations. All faiths which have been called as

Chapter III

ALLAH as the ONLY IDEAL and ULTIMATE GOAL

Allah is the ideal and the most comprehensive goal for the whole Universe : He alone is the all-embracing goal and there is no other goal beside Him. For, He alone is Complete and eveything else is incomplete ; and the complete naturally is the goal for the incomplete, since everything that is incomplete cannot be goal for any other incomplete thing. The incomplete thing can only serve as an instrument or means for the achievement of the end ; but this quality is common to all incomplete beings. Every incomplete being is to a certain degree the helper and the means towards the attainment of the goal by others. As such the Prophets, the Revealed Books and the Angels are not the goals in themselves but only the means for the attainment of the goal. Similarly Religion in itself is not the goal but only the means for the achievement of the ultimate goal—ALLAH. Exactly in the same way a good virtue in itself is not the goal. Therefore, anyone who may have acquired one or more virtues has not achieved the goal but is definitely far from it. He has not yet realized the purpose of his life completely, but as if he has either stopped before his destination or is still half way thereof.

Secondly, Allah is the foremost and the most sure goal. Everyone can reach Him although with some differences in time, depending upon his sefety from the calamities which beset the way. In the majority of cases however the length of time

inner self. Therefore, rites and ceremonials are necessities of man's life, in all its phases and aspects.

But there are differences between the ceremonials themselves, just as there are differences in the inner and latent qualities and faculties. The best and the right ceremonials are those which are most suited to the highest inner qualities. The imposition and assignment of such best ceremonials by Allah upon man is not therefore in any way unreasonable or objectionable.

You must know that *Rabbaniyyat* is the only natural condition of the normal behaviour of human beings. Any other condition contrary to *Rabbaniyyat* is an unnatural condition created by uncontrolled freedom of will which is only an abuse of this freedom. Such a contrary condition is the cause of deliberate strife and destruction in the Universe which is a natural outcome of perverted action, and is not superimposed one.

The process of destruction and degeneration is also due to the incompleteness prevailing in every part of the Universe. But one thing is decided ; there is always less of destruction, and more of reformation. For while the inherent incompleteness of the Universe as well as the unnatural condition of the uncontrolled freedom resulting into the abnormal behaviour of man, create strife and destruction, the natural law of *Rububiyyat* which is the law of nature, is continuously and constantly doing its great work,which overwhelms the unnatural work of destruction and degeneration.

Next, you should understand that all obligations from the side of Allah upon man, are in full accord with the normal requirements of human nature. Therefore, in the imposition of these obligations there is absolutely no selfishness; the purpose is to fulfill the natural order of man in order to fulfil the natural order of the Universe towards an ultimate fulfilment of the order of *Mashiyyatullah* (the Divine Will). There is no room for selfishness, absolutely no possibility of it ; because the Complete Being is self-sufficient. He neither needs anything, nor can He desire from, or find it with any incomplete being.

Lastly, you should also understand that ceremonials are the signs of inner self, and means of reaching the inner self; they are the exercises to develop the inner self and invitations to the

Such a dual nature of man full of contradictions, having great possibilities of both the completion and perfection, as well as destruction and annihilation of itself demands a particular set of duties complimentary to the peculiar combination of his own self.

This pattern of duties is comprised of three principal actions and conditions :

(1) Unification with *mashiyyatullah* (will of God) for safety from bewilderment ; annihilation of self through *fikr* (meditation), *zikr* (remembrance) and *Amal* (action).

(2) Penetration into the Universe for the purpose of preservation of life in it and for the evolution and elevation of the self. Penetration, initially from ones own environment to the highest reality—the Self of Allah ; penetration by means of knowledge and action for the possession and utilization of the Universe.

(3) Inculcation of *Rabbiyyat* (work of preservation) within one's own self as well as in the Universe in order to fulfil the particular role and special status of man as *Khalifatullah,* which means, to rule as the Deputy or Viceroy of God, over the whole Universe in accordance with the laws of *mashiyyatullah* for *Rabbiyat* of the Universe with pure and utmost zeal in accordance with the requirements of *Mashiyyat* this function is *Rabbaniyyat* (work of preservation by the beings of the Universe),

You should understand that it is only this natural condition of *Rabbaniyyat* on the part of man which itself justifies praise to him and reward for him. This reward though intentional on the part of Allah is not a bestowed one, but rather a natural one. It is contingent and conditional upon this natural work of *Rabbaniyyat.*

the Universe, you take *rabbiyyat* as well as *rabbaniyyat* to mean destruction of the whole for the sake of comfort of one particular part. But *rabbiyyat* has no such unreasonable meaning and cannot have. *Rabbiyyat* means preservation and protaction of the whole without any hesitation to mend, or end any individual part of the whole if warranted by necessity.

Secondly, mankind as a whole is one of the numerous parts of the whole manifestation of Allah ; as such, mankind has on its shoulders, duties and responsibilities similar to every other part which he is bound to fulfil as his natural share ; this he must do in order to serve the *mashiyyat* (will) of Allah for His work of manifestation and preservation.

Thirdly, mankind, like every other part of the Universe, is naturally subjected to the laws of *rububiyyat*, — the laws of creation, supervision, annihiliation and regeneration, or the great law of evolution.

Fourthly, as human beings have a peculiar nature of their abilities to fulfil their responsibilities, that peculiar nature demands for peculiar and particular duties to be assigned to them.

This peculiar nature of man lies in his free will which knows no limitations, and, in his ardent desire of possession : possession of the whole Universe at a single glance and, if it were possible, possession of Allah as well, either in form of humble unison with Him ; or in the form of rebellion against Him. This is one side of his peculiar nature. The other one lies in his renunciation of everything, even of his own soul, and bewilderment in all directions until right straight to destruction and annihilation.

of *rabbiyyat.* For, everything in nature, with the exception of petty man, never demand reward for its benefits. Then why is it that the Highest Being desires it ? In order to clear this apparent confusion, it is essential that you should know a few things which are very necessary for the understanding of the real nature of the *rabbiyyat* of Allah. In the first instance you must understand Intelligently the nature of relation of Allah with the Universe.

So far you know that the Universe is the manifestation of Allah ; it is not Allah Himself, but rather constitutes various parts and parcels, powers and conditions ; just as limbs, senses and various other powers and faculties constitute a complete human being. As such there is a natural relation, similar to that between a living person as a whole and various part of his body, between Allah as a Complete Being and all that constitutes the Universe. Just as each part of the human body performs its own function so are the various departments of the Universe including man, assigned definite duties and responsibilities and every person (as well as every other organism in the Universe) naturally expects every organ of his body to perform its own function properly and regularly ; when any part fails to perform its natural function he tries by all means to mend it if possible and end it if inevitable. This is but just and proper in view of the natural responsibility of the instinctive *rububiyyat* imbibed by every person towards instruments and organs assembled in the form of His hugeness. When this is just and proper in case of every being in the Universe, it is more essential and natural in the case of Allah in view of His *rabbiyyat* of numerous instruments and organs assembled in the form of HIS huge manifested constitution which goes by the name of *Alam* or the Universe, But if you say it is not just on the part of Allah to mend or end the various components of

it cannot be disobeyed, and is inevitably carried out within and without the Universe. This is the great secret of the marvellous harmony obtained in the nature of the Universe.

But the divine *mashiyyat* has also another method of work which is confined only to the human world. This is because the human world differs from other worlds in one great respect that, it is the world of free will of desire and to some extent free will of action. Therefore the divine *mashiyyat* has ordained the especial method of *hidayat* or guidance for the human world. This method, however, is so deep and mysterious that common mind cannot penetrate it ; only Prophets, or mystic philosophers can grasp its reality and significance. Yet, there is absolutely no doubt that this method is the most effective and its work and success guaranteed according to the laws of *mash-iyyat* in so far as the object of surmounting inevitable difficulties and progressing along the definite way for the achievement of the final goal is concerned. This way of *hidayat* has also a long series of orderly means and instruments, beginning from the self of Allah right to the human world, and within the human world itself. One of such series established in the human world, is the series of the Prophets, the Revealed Books, the Saints and the Philosphers.

As already explained the principal work of Allah is *rabbiyyat* after creation and manifestation Then what is the mystery and purpose of the work of revenge, punishment and destruction in the Universe ? What is the meaning of obligation of worship to Him, flattery for Him, and appeasement to Him in various forms to the extent of a heavy burden which seems so unbearable ? When this is all contrary to the work of *rabbiyyat* why is it there ? Moreover there is a pettiness about the Complete Being demanding praise for His work

Chapter II

ALLAH (GOD) AS THE WORKER

Islam teaches that *Allah Subhanahu Ta'ala*, (God, the most Glorious and High) is never idle and without work. He is always active and is working all the time according to His infinite capacity ; and since His capacity is unlimited, His work is also unlimited in magnitude; His method of work is also unlimited and far different from all the methods of work obtained in the Universe.

What is the nature of His unlimited work ? —His principal work is *rabbiyyat* of the Universe after its creation and manifestation.

By what means does He accomplish this work ? He accomplishes this work through His *mashiyyat* (Divine Will). His will is so infinite and strong that it can directly replace all the instruments of the Universe ; it is more than enough to work out all the marvels of the Universe. But the divine *mashiyyat* perfers being instrumental in the accomplishment of the whole work of the Universe through various instrumental agents and causes. All these instrumental causes or, in other words, the working instruments of the Universe are the tools of the divine *mashiyyat* without any exception.

What is His principle method of work ? This is His *amr* (divine command) ; His *amr* is so powerful and effective that

form or shape, since every form and shape is limited, while He is unlimited. Similarly, He is within the Universe, as well as without, because Universe is limited: it is only the manifestation of the Complete Being, who is infinite and unlimited; and what is unlimited naturally encompasses, as well as extends beyond that which is limited. All other questions may be judged through this fundamental understanding of Allah, as the Complete Being.

---

because of His being the highest, the deepest and the most beneficial Reality of the Universe. As such, every knowledge without the knowledge of Him is only ignorance which is devoid of real benefit and is misleading, destructive and the worst sort of curse. He deserves to be intentionally recognized in order to be loved, worshipped and followed : to be made the sole objective of all ambitions, actions and solicitations by love, faith, hope and reliance upon the assurance that He is always ready to help. For, love and help are His very nature and reality.

But knowledge alone is not enough ; to act in faith in the light of His knowledge is necessary. Knowledge without action emanating from that knowledge is disgrace and rebellion, both of which are the greatest curse. Knowledge in such a situation does not do any good, but harm ; while ignorance with or without opposition to His knowledge is the greatest calamity.

Man in spite of his limited vision has tried to grasp the actual nature of Allah in the light of worldly conceptions. Questions have always been raised as to what is His form and shape ? Is He within or without the Univere ? Is He mortal or immortal, limited or unlimited, concealed or obvious, material or spiritual, far or near, etc. etc. The answer to all these questions in two words is, that He is "Complete Being". And one who is complete is naturally comprehensive of all that which applies to incomplete beings. As such, Allah has form and shape also, though not any special or particular, but indefinite and comprehensive.

All forms and shapes of the Universe which are apparent and obvious or hidden and concealed are forms and shapes of Allah the Complete Being,— insofar as they are all His manifestations. But in spite of all that is said, He is without any

is mover, *rububiyyat* is movement ; *olohiyat* is motive, while *rububiyyat* is action.

Next, you should know and understand that *rububiyyat* is a universal quality. It pervades the whole Universe and prevails throughout the Universe. It is imbibed in the nature of every being of the Universe. The supreme source of this universal quality is, however, Allah, in whom only it is unique and complete. But every being is capable of seeking more and more of it through the Supreme Source, and acquiring more and more of it according to his own capacity.

What constitutes the peculiarity and uniqueness of *rububiyyat* ?

Its uniqueness lies in the combination of four conditions within itself :

Firstly : *Alamiyyat*, i.e. universality.

Secondly : *Rahmaniyyat*, i.e. "Lovism" combined with *Rahimiyyat*, i.e. mercifulness.

Thirdly : *Malikiyyat*, i.e. ownership.

Fourthly : *Dayyaniyyat* i.e. judiciousness.

You should know that it is only the *rububiyyat* of Allah which is unique and as such, combines all the four conditions within itself. But as its spirit pervades througout the Universe there is every possibility for all beings to acquire more and more of it to the greatest possible degree by seeking nearness to it. It is the most natural and instinctive quality of the *rububiyyat* to be inculcated within and to be embibed by all the things of the Universe.

Islam teaches that Allah deserves in the highest degree to be known to the extent of the highest possible necessity; it is

bad ones. His central quality is that of *Rububiyat* (preservation), around which all His other qualities are revolving and are working for it. By this statement, Islam points out to one great reality and desirability that the whole Universe is established on the basis of *Rabbiyat* (work of preservation) and is flourishing due to the effect of RUBUBIYYAT as the quality and action of *Allah* ; it means every power of *Rububiyyat*. You should know that it is only the quality of *Rububiyyat* which is the realm of the practical life of Allah and the Universe, and deserves real admiration and praise. All praise, whatsoever it may be, and wherever it may be, ought to return to this highest value of reality; every admiration and praise which is not returning to the *Rububiyyat* is false, corrupted, deceiving and destroying.

In the first instance we explained that Allah—the Complete Being—is Love, and we emphasized His supreme quality of this *olohiyat*-love.

In the second place we have shifted our emphasis upon His central quality of *Rububiyyat*, or preservation. You may naturally inquire about the inter-relationship between these two great qualities, as well as a comparison of the two.

You may very well ask which deserves the first place and which the second. So far as the comparison is concerned, the fact is that both these qualities are of primary importance and belong to the first and the highest order. The only difference is that *olohiyat* takes the first place amongst the instinctive qualities, while *rububiyyat*—preservation—takes the first place amongst the practical qualities of Allah, the Complete Being. But what is the connection between the two ? The connection is this : *olohiyat* is the cause, while *rububiyyat* is the effect ; *olohiyat* is the root, *rububiyyat* the fruit ; *olohiyat*

logical inference. For knowledge of man is defective and his observation is limited. He has not been able to observe even the incomplete objects of the Universe which have a material form and shape until now.

Since the dirct observation of even incomplete objects in form and shape is impossible, there is no wonder that the direct observation of the Complete Being, who is formless, should be absolutely impossible. But even though the knowledge and direct observation of incomplete objects is defective their existence is taken for granted. It is enough, therefore, to believe in the existence of a Complete Being or the Supreme Cause through the observation of His manifestations and effects.

Finally, as the Complete Being is also known phenomenally, its existence is definite and sure: its belief essential as knowledge of the highest reality and as the most vital means of the greatest benevolence.

Islam gives to this Complete Being the name of ALLAH, which literally means the *lover*. Such a conception of His 'reality—manifesting' name signifies one great truth that the first quality of the Complete Being, is *olohiyat*, and that all His connections, manifestations,and actions—established, performed and to be performed, are a result of emotional love and not due to any other motive ; it also leads to the fact that the existence and movement of the whole Universe is in action as a result of *olohiyat*-love.

This is in fact the secret reality of life. Therefore, if any one desires to live the true way of life he should follow the path of love, and love alone, and no other part that is contrary to it.

Islam teaches that Allah is the supreme source of all good; that He possesses all good qualities and He is immune from

everything in it would be impossible. But since it exists, the existence of a Complete Being in it becomes definitely sure and certain.

This is the philosophical and logical proof of the existence of a Complete and Perfect Being in the Universe.

Now you might reasonably inquire if there is any phenomeenal proof of the existence of a Complete Being. Yes. And I will make you to understand that there is not only one proof, but many. However, one will be sufficient for now

You have known one great scientific truth that for every cause there is an effect, and vice versa; every effect must necessarily have a cause. Therefore, presence of an apparent result or effect is a sure proof of the presence of its cause.

Thus the apparent presence of a branch, a leaf and a shadow, or waves, or an electric current necessarily implies the real presence of a tree, an ocean and electricity respectively. From this simple analogy you should understand that all incomplete things are the results or effects or currents and waves of some Real and Complete Being who is the supreme cause, the supreme source of all the apparent effects, results or manifestations in the Universe.

Therefore, the manifestation of all the incomplete objects in the form of the Universe as a whole, is the menifestation of the complete being as a whole, or nearly as a whole; and the observation of this manifestaion is in fact the observation of the Complete Being. But this observation is effectually and not personally, that is, man can see the manifestation of the Complete Being and not His person. This is not a matter of wonder ; it is neither against reason nor contrary to any

its very heat destroys life in the tropical hot belts of the earth. It is incapable of giving that coolness which is equally essential for the life on earth.

Again, look at the moon; you might think it to be perfect for its pleasing coolness and charming moonlight—but it lacks the other half of usefulness; it is incapable of giving that warmth which is essential for the life on earth.

We have taken for example only these two, In fact a close examination will show that all objects in this Universe are incomplete and imperfect in reality. In other words we may say that the Universe which is the sum and substance of all existence, is incomplete and imperfect.

Now, you should know and understand that the existence of incomplete things without being dependant on a Complete Being, is absolutely impossible; for incompleteness and independent existence are contradictory to each other. Incompleteness always implies non-existence of something which is impossible and necessary; besides, incompleteness is also a sign that the object owes its existence to some other source. On the other hand, a complete and independent existence must be by itself, and not due to any other source; moreover, a complete and independent existence should necessarily include the existence of every other possible and necessary thing within itself.

So we have explained to you that : (a) everything and every object in the universe is incomplete and imperfect; or in other words, the Universe as a whole is incomplete and imperfect; (b) that the existence of an incomplete and imperfect thing, without and independent of a Complete Being is impossible Finally, if the universe be without a Complete Being the existence of the Universe, or in other words, the existence of

Chapter 1

ALLAH (GOD) AS BEING

The first and fundamental teaching of Islam is that the universe is not empty of a Complete Being. Who is the soul of it. He, (GOD) is the *only one* Complete Being,—the *only* Complete Reality, the *only* Complete Stability and the *only* Complete Responsility. These are His exclusive attributes since all other beings of the universe are incomplete in reality, incomplete in stability and incomplete in responsibility.

The proof of this is not far to seek. You may take any other being of the Universe and examine it from the point of view of reality, stability, and responsibility and you will find it imperfect and incomplete.

If you want to be assured of a practical proof of the incompleteness of things, look at the human species which is the nearest to completeness and perfection. You will find that no individual is perfect: everyone has one or more defects and shortcomings, e. g. an individual may have beauty but lack wisdom and vice-versa; one may have wisdom but not character, and vice versa! thus every individual if he has one virtue, he lacks another and is bound to fall short of the sublime perfection of all the higher virtues of life.

Again, look at the sun which you might think is perfect on account of its heat and light, which is so very useful for the life of organism on earth; yet it is a mass of burning matter, and

sincere efforts, they should rather address me and I shall willingly respond; they should enquire from me, and I will readily explain. No doubt this booklet claims original contribution to Islamic thought and philosophy; but the critics ought to know that originality is traditional in Islamic thought ever since the days of Ashaari and Ghazali. If in this age, Subhani revives this originality, he is not working against this great tradition, but for it.

I should also make it clear that though the language as well as the style of this booklet, are peculiarly my own, much is due to the untiring efforts of my dear friend Abdullah Uthman as-Sindi of India who is deeply interested in the Philosophy of Rabbaniyyat, and who at present is a student of Ph. D. at the Columbia University. He has put much of his knowledge and experience in revising the original manuscript, correcting its mistakes in language, rearranging its arguments in logical sequence, and giving it final shape and form for the publication. I am most thankful to him for his sincere efforts in accomplishing this great task.

Yet in spite of all this, some mistakes of expression contingent upon my own style are but inevitable. I hope the kind reader will skip over them, concentrating his attention more upon ideas than upon expression, devoting himself more to the spirit rather than to the form of the document.

Finally, I pray to Allah the Almighty, to place this insignificant effort under the shade of His *rububiyyat* so that it may prove useful and fruitful.

Ameen be-haqq-e-Sayyid-al-Mursalin

Subhani Rabbani

A humble servant of Islam and humanity.

PREFACE

This booklet which is now in your hands is designed to serve as a part of the contribution or the Philosophy of Rabbaniyyat to the cause of Islam and humanity. One object of the Philosophy of Rabbaniyyat and its Rabbani Movement is to scrap off ignorance and inaction which have lately overshadowed the sublime teaching of Islam. The Philosophy of Rabbaniyyat aims at dispelling the ignorance while the Rabbani Movement attempts at scrapping off the ignorance. As such, the Philosophy of Rabbaniyyat and the Rabbani Movement claim to occupy the central position amongst all thoughts and movements which have ever rendered this kind of service.

This book is written primarily for the beginners ; it does not address itself to the more mature minds. However, the more learned ones might glean into it, the nature and character of an advanced work which is being prepared to serve their particular needs. This one is the first booklet of this series and will be followed by others which are expected to be as useful as the present one.

So far as I know, this is the first booklet of its kind in the history of Islam. It is also unique in its presentation of fundamental Islamic teachings. As such it is also liable to be misunderstood by those who are used to condemn every original and scientific exposition of Islamic teachings as anti-Islamic. I entreat all such critics not to be hasty in their judgement. Before making any loud condemnation of these serious and

merely an abstract or theoretical philosophy, but, it is the most constructive and practical philosophy of life. If it succeeds to rally intelligent thought around its basic truths, it will surely rescue the human race from the destructive mood to which it seems to have pledged itself.

Columbia University
January 3, 1947

Abdullah Uthman Al-Sindi

But then suddenly his attention was diverted to Indian nationalism and Indian politics. This new trend completely cut him off from the pursuit of scientific knowledge for a considerable period of time. It was only recently that he was able to retire from politics to his original purpose. Though he made a considerable headway in the development of his philosophical thought, to which he now gives the name of "Philosophy of Rabbaniyyat", he could not find time to reduce it to writing. So far, he has expressed his preliminary ideas in two booklets published in Hindustani language, namely, *The Philosophy of Religion*, and the *Manifesto of Rabbaniyyat*. The present one is his third booklet which he has deliberately attempted in the English language.

Azad Subhani, however, never studied English in any school. He picked it up casually, and, it is only in America that as he says, "I learnt to write and speak English". It is indeed a credit to his genius that in such a short period of time he has been able to accomplish this great task", for he arrived in America by the end of October 1946 i.e. only about two and a half months back.

The sole purpose of his visit to America, is to collect further data for the development of his Philosophy of Rabbaniyyat, through his personal observations of life here and through mutual exchange of ideas with the people of this great country. With this same object in view, he has already travelled throughout the Middle East and the Western Europe. He thinks, he will still have to travel the remaining parts of the globe for the accomplishment of this great purpose.

The author presents his Philosophy of *Rabbaniyyat* as a Universal Philosophy which can serve the needs of mankind. Definitely his Philosophy of *Rabbanıypat* or Preservation, is not

INTRODUCTION

Maulana Azad Subhani, on account of his characteristic faith in the ability of the youth, has encouraged me to write an introduction to this valuable brochure. I think the best I can do is to introduce the dynamic personality to the occidental reader.

Azad Subhani was born at Skindarpur, in the United Provinces in India about 1882. He received his liberal education in the traditional *Madrasahs,* the Islamic Religious Schools *of* India. There he studied Arabic language, Religion of Islam and the Greek Philosophy through Arabic, which then formed a part of the old and traditional curriculum taught in these *Madrasahs.*

His inquisitive and critical mind soon rebelled against this out of date aspect of Greek Philosophy and he soon began to think in terms of a new Philosophy which could serve religion as well as be instrumental in further investigation of deep and profound realities of life. With this purpose in view, he founded *Madrasah-e-Ilahiyat* (the School of Divinity) at Cawnpur in India, where he taught philosophy in general, and, philosophy of Religion in particular for seventeen years. It was during this period that he gave his full thought and attention to the rudiments of his own philosophy and collected data for its development.

CONTENTS

Introduction	1
Preface	4
Allah (God) As being	7
Allah (God) As the Worker	15
Allah as the Only Ideal and Ultimate Goal	23
Alam - the Universe	27
Insan and *Alam* (Man and the Universe)	29
One great Mission of Islam	32
The Rabbani Movement	32
Index	33

THE TEACHINGS OF ISLAM IN LIGHT OF THE PHILOSOPHY OF RABBANIYYAT

FOR BEGINNERS

BY SUBHANI RABBANI

First Series

Book—I

"ALLAH AND ALAM"

(God and the Universe)

Sponsored by

ACADEMY OF ISLAM INTERNATIONAL, Inc

Office

1861 Madison Avenue

New York 35, N Y